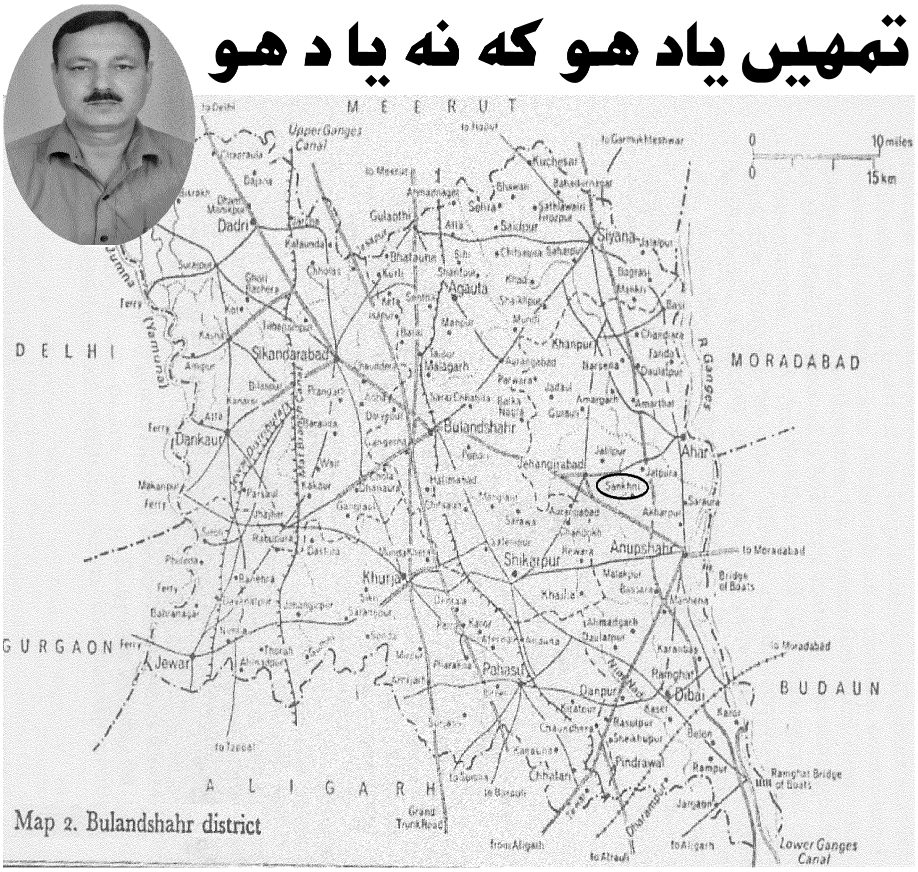
تمھیں یاد ھو کہ نہ یا د ھو



Map 2. Bulandshahr district

مؤلّف

مرزا غلام حسن

پتہ

۲۰۷۔العباس، گرین پارک، نزد ایف۔ایم۔ٹاور،

انوپ شہر روڈ، علی گڑھ۔۲۰۲۱۲۲

تشکر نامہ

ممنون و مشکور ہوں اپنے داماد محبی مرزا پرویز اختر، کوالٹی منیجر (یو اے ای) و بیٹی سکینہ حسن، جونیئر انجینئر اور پیاری پیاری سی نواسیاں کساء اختر مرزا و عالیہ اختر مرزا کا جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں اپنا بھرپور تعاون پیش کیا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

مرزا غلام حسن

نام کتاب	:	**تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو**
مؤلّف	:	مرزا غلام حسن
ترتیب و تنظیم	:	مرزا اشفاق حسن سانکھنوی
سن اشاعت	:	**۲۰۲۰ء**
کمپوزنگ	:	مسرور اللہ خاں (اے ایم یو، علی گڑھ)
طباعت	:	علی گڑھ
قیمت	:	برائے ایصالِ ثواب والدین
دستیاب	:	(۱) محترمہ رضیہ زیدی، العباس، گرین پارک ایف ایم ٹاور، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ۔
	:	(۲) مرزا محمد ظاہر حسین، مرزا کمپاؤنڈ، نزد مسجد عظیم بیگ، سانکھنی بلند شہر، یو پی۔
	:	(۳) ماسٹر مرزا مجاور حسین 'مصاحب منزل' حیدری بازار، سانکھنی، ضلع بلند شہر، یو پی۔

فہرست

تقریظ

''چلا ہوں جہاں سے لیے جیونی میں
اسی کے سدا گیت گاتا رہوں گا''

کسب معاش کے لیے علی گڑھ میں سکونت ثانی اختیار کر لینے کے بعد بھی اپنی بستی سے صرف روحانی طور پر جڑے رہنا ہی نہیں بلکہ اُس بہشتِ ارضی کے متعلق مسلسل سوچتے رہنا یعنی اِسکا اِرتقاء۔ قیام۔ ترقی پذیر ہونا۔ آبادی کا بڑھنا۔ مذہبی رجحانات ۔تعمیرات کا عمل پذیر ہونا۔ معاشی ،سماجی وسیاسی تبدل وتغیرات ۔کاشت کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم کی طرف پوری توجہ مبذول کرنا،اس ذہن رسا کا ہی حصہ خاص ہے جسے ہم مرزا غلام حسن کے نام سے جانتے ہیں۔زندگی کے تینوں ادوار۔بچپن۔ جوانی۔تقریباً آخری پڑاؤ۔کے ان نقوش کو جو اس پیاری زمین سے وابستہ ہیں۔صفحہ قرطاس پر وہ بھی ایک یادگار تاریخی دستاویز کی شکل میں قلم بند کرنا آسان کام نہ تھا۔مگر دھیرے دھیرے آنکھوں کے سامنے ایک یادوں کی حسین تصویر بنتی اور ابھرتی چلی گئی جس کو آخرش خوبصورت سا نام۔''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' حاصل ہوا۔ بلاشبہ یہ ٹائٹل ان ذہنوں کو بھی بیدار کرنے میں یقینی طور پر حقیقی معاون کا رول ادا کریگا جو کہیں بھی کسی بھی روپ میں ہوں مگر اس ارض مادر کا نام اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہیں۔

جب سے سانکھنی وجود میں آیا اسنے اس لمبے عرصہ میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔کورو پانڈووں کی حکومت (یعنی ہستنا پور کے علاوہ کندن پور (اہار) مہرسہ وغیرہ) کے دوران بھی سانکھنی کے وجود کے تاریخی نقوش قدیم مہادیو مندر کی شکل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بعدہٗ اس کو کس کس خطہ سے الحاق حاصل

ہوا مثلاً راجستھان، بنارس اور بنگال وغیرہ۔ اس بستی کو ماضی کی ایک جیتی جاگتی اہم یادگار کہنا کسی بھی طور پر بیجا نہ ہوگا۔ مغل سلطنت کی شاہکار یادگار مغل مسجد جس کی بنیاد ۱۶۵۵ء میں رکھی گئی، بستی کا بلا شک وشبہہ چار سو سال (اس سے بھی کہیں زیادہ) قدیم ہونے کا ثبوت بنتا ہے۔

معاشی واقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی تحریکات اور علاقائی سیاسی اثرات نے سیدھے سادے قصباتی باشندوں میں نیا شعور پیدا کیا جس کے نتیجہ میں ایک دوسرے سے افضل ہونے کی سم آلود ذہنی کاوش نے بھی جنم لیا اور ایک ہی بستی کو دو بڑے حصوں میں جدا کر کے نئے نام۔ پوئیاں۔ پچھیاں (یعنی شرقی وغربی) دیدئے۔ انجام بالکل واضح تھا۔ جان ومال داؤ پر لگے۔ نقصانات تکلیف دہ۔ مگر وقت کے مرہم نے نشانات مندمل کردئے ہیں۔ مؤلف اس معنی کر دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ غلام حسن نے بغیر کسی طرح کی طرفداری کے بستی کے تمام وجود کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے تعمیرات، فروغِ عزاداری میں حسینی انجمنوں کا تعمیری رول، اہم شخصیات کا ذکر جو اپنے اپنے فیلڈ میں یکتا رہ چکی ہیں مع مرزا یونس علی ''قلندر'' اور دورِ حاضر میں بھی ہیں۔ تعلیمی اداروں، امام بارگاہوں، مساجد وغیرہ کا ذکر نہایت دیانتداری سے کیا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کسی کا ذکرِ خیر نادانستہ طور پر رہ گیا ہو تو وہ اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ سانکھنی کے ساتھ ضلع ہیڈ کوارٹر ''برن'' یعنی بلند شہر کا مختصر تاریخی تعارف، مختلف حکمرانوں کا ذکرِ خیر، مختلف وقت کے قحط (جس سے سانکھنی کے باشندے دوچار ہوئے)، ۱۸۵۷ء کی بغاوت، اطراف کے زمینداروں کا رول، تعلیمی نظام ومختلف اداروں کے اعداد وشمار پڑھنے والے کو دلچسپی کا مواد مہیا کرتے ہیں۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کا ایک قدیمی فیصلہ بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

ضخامت کی رو سے گو مختصر مگر انفارمیشن سے لبریز ''**تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو**'' دلی مبارکباد کا مستحق ہے۔ غلام حسن تمہیں خالق اکبر اس طرح کی تالیف کے لیے عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین! اس امید کے ساتھ کہ آنے والی نسلیں بستی سانکھنی کو ''یونائٹڈ'' کی شکل (نہ کہ دو حصوں) میں دیکھیں اور جانیں۔ ساتھ ہی

دوسرے قلم کے دھنی بھی اس کو پڑھ کر طبع آزمائی ضرور کریں گے، یعنی سانکھنی کے اُن چھوئے گوشوں کو اجاگر کریں گے۔

سید انور علی زیدی
سابق رجسٹرار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۴/۱۰۸۶ وائٹ ہاؤس، سر سید نگر، علی گڑھ

انتساب

والد ماجد محترم مرزا غلام حسین مرحوم
والدہ ماجدہ محترمہ نادرہ بیگم مرحومہ
اور
برادرِ عزیز محترم مرزا مظاہر حسین مرحوم
کے نام
جن کی بے پناہ محبتوں اور شفقتوں کے زیرِ سایہ مری ذہنی اور علمی تربیت پروان چڑھی

بقول شاعر کوثرؔ رام پوری

موت بھی تجھکو ماں! نہ مارسکی
اب بھی زندہ ہے میرے دل میں تو

مرزا غلام حسن

مرزا غلام حسن سانکھنوی

مرزا غلام حسن کی زندگی اور کارناموں کو اس مختصر تعارف میں پیش کرنا میرے لئے نہایت دشوار کن مرحلہ ہے۔ اس تعارف نامہ میں ان کی شخصیت سے متعلق کچھ اہم نکات کو وَاشگاف کرنے کی کوشش ضرور کرونگا۔ مرزا غلام حسن نے یکم نومبر ۱۹۶۱ء کو اُترّ پردیش کے مشہور ضلع بلند شہر کے معروف قصبہ سانکھنی کے ایک معزّز اور مہذّب خانوادے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد بزرگوار کا نام مرزا غلام حسین تھا، جنھیں اہل قریہ کے درمیان بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بستی کے تمام لوگ اپنی عرفی زبان میں انھیں ماموں کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ مرزا غلام حسن کی ابتدائی زندگی کے پانچ سال (گاندھی چوک بلند شہر میں) اپنے نانا کی آغوش تربیت میں گذرے، ان کے نانا کا روحانی رشتہ صوف وسلوک سے تھا، یہی وجہ تھی کہ مرزا یونس علی صاحب کا شمار اطراف واکناف کے اہم صوفی قلندروں میں کیا جاتا تھا۔ ان کے آستانے پر اکثر و بیشتر ضلع بلند شہر کے گردونواح کے صوفیائے کرام کی خاصی بھیڑ رہتی تھی۔ مرزا غلام حسن نے اپنی ابتدائی تعلیم درجہ اوّل سے دسویں جماعت تک اپنے آبائی وطن کے حیدری انٹر کالج سانکھنی میں حاصل کی، جس کی مینیجنگ کمیٹی کے وہ حیاتی ممبر بھی ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں انٹرمیڈیٹ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں داخلہ لیا، لیکن ذہنی اُلجھنوں اور نامساعد حالات کی بنا پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو ترک کرنا پڑا۔ اس

کے بعد اسی سال یعنی ۱۹۷۷ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں پی. یو.سی. میں داخلہ لیا اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجوئیشن کیا اور سیاسیات میں ماسٹر کی سند حاصل کی۔ لیکن اپنی مادری زبان سے دلچسپی کی وجہ سے ایم.اے.(اردو) کی سند بھی حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد تقریباً پانچ سال تلاشِ معاش کے سلسلے میں بیرونی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ ستمبر ۱۹۸۷ء میں سیّد انور علی زیدی صاحب (سابقہ رجسٹرار علیگڑھ مسلم یونیورسٹی) کی خصوصی توجہ کے سبب یونیورسٹی میں کلرک کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد مختلف دفاتر میں جیسے گیمس کمیٹی، ایجوکیشن، انجینئرنگ کالج، ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس اور فی الحال ڈپارٹمنٹ آف میڈسن، جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج اے.ایم.یو. علی گڑھ میں سیکشن آفیسر ایڈمنسٹریشن کے عہدے پر اپنی ڈیوٹی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اسکے علاوہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نان ٹیچنگ ایسوسی ایشن کے ممبر بھی رہے اور ۲۰۰۲ء میں یونیورسٹی کورٹ ممبر کا الیکشن بھی لڑ چکے ہیں۔ وہ نہایت قابلِ قدر اور لائقِ تحسین شخصیت ہیں وہ اے.ایم.یو. میں جتنے بھی عہدوں پر فائز رہے انہوں نے اپنے ہر عہدے کے ساتھ انصاف کے معاملہ کو رَوا رکھا، اور متعدد شعبوں میں اپنے فرائضِ منصبی کو بحسن خوبی انجام دیا اور انہوں نے ہمیشہ اخلاقی قدروں کا خاص خیال رکھا۔

مرزا غلام حسن ہمہ گیر، تہہ دار اور دِل آویز شخصیت کے مالک ہیں، ایک انسان کی شخصیت میں جتنے ذاتی صفات کا ہونا لازمی ہے، وہ تمام کی تمام ان کی شخصیت میں موجود ہیں ان کی ذاتی شخصیت میں دردمندی، انسانی ہمدردی، بلند نظری اور وسعتِ قلبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی

ہے۔ مرزا غلام حسن اپنے تمام نیک مقاصد کو اپنی زندگی کا نصب العین تصور کرتے رہے، وہ کبھی بھی ذاتی مفاد کو بروئے کار نہیں لائے بلکہ انہوں نے قوم کے مفاد کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا اور ان کی وسیع القلبی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انکے نزدیک بڑے اور چھوٹے کی کوئی امتیازی حیثیت معنی نہیں ہے۔

مرزا غلام حسن کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ان کی طبیعت میں نرمی اور ملنساری ہے وہ کبھی بھی اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کرتے۔ انہیں خصوصیات کی وجہ سے انہوں نے خلوص و پیار کو لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھا ہے، جب وہ کسی سے ملاقات کرتے ہیں تو اپنے مخصوص اور متبسّم انداز کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتے ہیں اور وہ ہر ملنے والے کے دِل میں دھڑکن کی طرح رہتے ہیں۔ ان کے دل میں وطن کی محبت نے ماضی کے گہرے احساس اور روایات کی روشنی کو دوبالا کر دیا اور تاریخی واقعات کو تحریر کرنے کی طرف متوجّہ ہوئے، ان کی یہ دلی خواہش کسی نہ کسی انداز میں وطن کی تاریخ کو مرتّب کرنے کے لئے اپنے آپ میں ایک انفرادی اہمیت کی حامل ہے۔ مرزا غلام حسن کے مضامین اور تحریریں گویا کسی بھی موضوع پر ہوں ان میں سلاست و روانگی کے ساتھ فنی خوبی بھی پائی جاتی ہے، وہ اپنی تحریروں میں دقیق الفاظ کا استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی اس تحریر میں تاریخی حقائق کو پیشِ نظر رکھّا ہے۔ ان کی تحریروں کو سمجھنے میں قاری کو ذہنی مشقت نہیں کرنی پڑتی بلکہ ان کی تحریر خود قاری کے ذہن کو جھنجوڑتی ہے۔ یہی وصف ہے کہ قاری مولّف کے مافی الضمیر کو آسانی سے درک کر لیتا ہے۔ ان کے مضامین اکثر و بیشتر مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شعر

وسخن سے بھی خاصا شغف رکھتے ہیں، لیکن باضابطہ شاعری نہیں کرتے۔

مرزا غلام حسن وطنِ سانکھنی کی ایک اہم ترین شخصیت ہیں جو وطن اور بالخصوص نوجوان نسل کی امیدوں اور آرزوؤں کا محور ہیں انہوں نے اپنے مضامین کو انفرادیت بخشی اور اپنی صلاحیت کے بنیاد پر اس بھیڑ میں اپنا ایک نمایاں مقام پیدا کیا ہے۔ اس کی خاص وجہ ان کی تحریروں میں جذباتی ہم آہنگی، آپسی میل ملاپ اور بے لوث محبت کا جذبہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ نثر نگاری، وقاع نویسی اور ملازمت دو متضاد چیزیں ہیں، اس کے باوجود انھیں جتنا وقت دستیاب ہے اس کا استعمال بھرپور طریقے سے کرتے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مرزا غلام حسن نے متعدّد موضوعات وعنوانات پر خامہ فرسائی کی ہے جس میں دینی، ادبی، تاریخی واقعات شامل ہیں بلند شہر کی سرزمین اردو ادب کے لئے ایک زرخیز سرزمین ہے یہ زمین شاعروں، ادیبوں اور علماء کی سرزمین رہی ہے اور اس سرزمین نے بہت سے ممتاز اہل قلم پیدا کئے ہیں جن میں رئیس الحفاظ کفایت حسین صاحب، علاّمہ محمد بشیر انصاری فاتحہ ٹیکسلہ، انتظار حسین، ماہر القادری، امّید فاضلی، مصطفٰے خان شیفتہؔ، کشور ناہید، ندیم نیّر، رئیس الدین رئیس، ابنِ کنول، منیب الرحمٰن، ہرگوپال تفتہؔ، نخشب جارچوی اور موجودہ دور میں مرزا شفیق حسین شفقؔ اپنے قلم کی ضیاء بکھیر رہے ہیں، کوئی بھی منصف مزاج اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ مرزا غلام حسن کی تحریریں معیار کی بلندی کا ضامن نہیں ہیں، اور تاریخی واقعات کو رقم کرنے میں انہیں مہارت ودسترس حاصل ہے، اس میں

کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے اس عہد کے مقبول قلم کار رہیں ان کی سادہ بیانی ہر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ محظوظ بھی کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تاریخی و ادبی کتاب وطن کے بہت سے نوجوان ذہنوں کو اپنے مستقبل کی تعمیر اور تشکیل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کریگی۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ ان کی یہ تاریخی کاوش منصۂ شہود پر آنے کے بعد قارئین سے کامیابی کی سند حاصل کرے گی۔ ہم ان کی تحریروں میں طلوع ہونے والے ایک خوش آئند مستقبل کے منتظر ہیں۔

مرزا مجاور حسین سانکھنوی
ہیڈ مدرس

سیّد حسین مہدی کاظمی سحرؔ نگینوی
بھمولہ، علی گڑھ

تعارف

اے غُلامِ حسنؑ غلام حسن — خادمِ پنجتنؑ غلام حسن
ذکر تیرا کروں میں کس منھ سے — تو ہے اہلِ سُخن غلام حسن
فنِ شعر و ادب میں ہے یکتا — ماہر فکر و فن غلام حسن
میں ہی کیا غیر کو لبھاتا ہے — وہ تِرا بانکپن غلام حسن
جاں نثارِ علیؑ مُحبِّ حسینؑ — پیروِ پنجتن غلام حسن
کثرتِ مہماں نوازی سے — ہے مِثالِ حسنؑ غلام حسن
بات میں شہد جیسی شیرینی — ایسے شیریں دہن غلام حسن
کرتے رہتے ہیں سب سے نیک سلوک — خوش بیاں خوش سخن غلام حسن
یارب اہل و عیال پر اپنے — رہیں سایہ فگن غلام حسن

یہ تمنّا سحرؔ کی ہے تیرا
رہے تازہ چمن غلام حسن



الحاج مولانا مرزا محمد اشفاق شوقؔ
شاہ گنج، لکھنؤ

تعارف

شمع دیدہ وری غلام حسن — مثلِ آگہی غلام حسن
تم سے میرے خیال کی بستی — مہکی مہکی رہی غلام حسن
حُسنِ صورت بھی حُسنِ سیرت بھی — یوسفِؑ زندگی غلام حسن
جس کو کہتے ہیں سب غلام حسین — اس کے دل کی کلی غلام حسن
نازشِ گلشنِ بلند شہر — غنچہ سانکھنی غلام حسن
ہر نفس ساتھ ساتھ رہتے ہیں — حُبِّ مولیٰ علیؑ غلام حسن

شوقؔ ڈھونڈا گیا ہے تیری بات
جب کہیں چھڑ گئی غلام حسن



سید رفیع الحسن رفیع سرسوی

تعارف

علم کی نرسری غلام حسن   آپ کی سانکھنی غلام حسن
عہد نو میں وطن پرستی کو   تم سے سیکھے کوئی غلام حسن
کہہ رہے ہیں حقائق تاریخ   نازش سانکھنی غلام حسن
یاد کرتی رہے سدا تم کو   انجمن حیدری غلام حسن
نادرہ کی دعاؤں کا پھل ہے   ذات یہ آپ کی غلام حسن
لائق احترام میرے لئے   شخصیت آپ کی غلام حسن
باب حیدرؑ سے تم نے پائی ہے   علم کی روشنی غلام حسن
اس علی گڑھ کی سرزمیں سے تمہیں   کیسی عزّت ملی غلام حسن

دل کی بات

مختصر سی ہے یہ مری کوشش
پڑھئے تاریخِ سانکھنی کیا ہے
(عدیؔل سانکھنوی)

تاریخِ سانکھنی پر خامہ فرسائی کرنا مجھ جیسے کم علم کے لئے دشوار کن مرحلہ ہے۔ مجھے اپنی کم علمی کا مکمل اعتراف ہے لیکن پھر بھی احباب کے اسرار پر اپنے ان بے تکُے لفظوں کو صفحۂ قرطاس پر تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ معترض میری اس کوشش کو بھی تنقید کی نظر سے دیکھینگے۔ لیکن میں مولائے کائناتؑ کے قول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اپنی کوشش جاری رکھونگا۔ مولا علیؑ نے فرمایا ''کہ لوگ جب تمہارے دشمن ہو جائیں تو سمجھو کہ تم میں کوئی کمال پیدا ہو گیا'' اسی قول نے مجھے حوصلہ بخشا اور سانکھنی کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوششیں کبھی رایئگاں نہیں جاتیں ہیں۔ ایک عرصۂ دراز سے دل میں تمنا تھی کہ اپنے وطن کے ساتھ ساتھ اپنے ضلع کی تاریخ پر کچھ لکھا جائے۔ اپنے وطن اور اپنے ملک سے ہر انسان کو پیار ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو؟ آخر وہ اپنے وطن کی مٹی میں کھیل کود کر پروان چڑھتا ہے، وہاں کے ذرّہ ذرّہ کا اِنکشاف کرتا ہے جو اسکے اندر پوشیدہ ہوتا ہے

اسی محبت کو دل میں رکھتے ہوئے میں نے بھی اپنے دل میں دبی ہوئی خواہش کو آپکے سامنے لانے کی کوشش کی ہے امید ہے جو بھی تاریخی واقعات آپکے سامنے آئینگے آپکی دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔ تاریخ حاضر ہے یہ فیصلہ اہل علم و دانش کے حُسن نظر پر ہے کہ وہ ان اوراق پریشاں میں سے چند معلومات اپنے ذوق وقلب کی تسکین کا سامان سمجھ کر چن لیں۔

تاریخ دو ہی شکلوں میں سامنے آتی ہے۔ ایک وہ جو قلم بند کر دی جائے اور تصنیف و تالیف میں منتقل ہو کر کتابوں کی شکل میں آپکے سامنے پیش کی جائے۔ تاریخ کا دوسرا رُخ آثارِ قدیمہ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ جو بہر حال جیتی جاگتی تصویریں ہیں، سسکتی ہوئی، خستہ وشکستہ حالت میں، فرسودہ اور ٹوٹی پھوٹی، لیکن یہ تصویریں اپنی تاریخ خود دہراتی ہیں۔ اپنے دور کی کہانی سناتی ہیں۔ یہی تصویریں ان کے عروج و زوال کا مظہر بھی ہیں۔ حقیقتاً یہ تصویریں، یہ آثار خود میں مکمل لیکن خاموش داستانیں ہیں جو صفحۂ ہستی سے رفتہ رفتہ مٹتی جا رہی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب چند مقامات پر چند عمارات کو چھوڑ کر سبھی کچھ گمنامی کا شکار ہو جائیگا۔

آثارِ قدیمہ سے مجھے بچپن سے ہی عشق رہا ہے جسکی وجہ سے تاریخ سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ خصوصاً قصبہ سانکھنی و بلندشہر کے عہد وسطیٰ کی تاریخ جو ہماری تاریخ ہے۔ مسلم ثقافت کی تاریخ ہے۔ تہذیب وتمدّن کی تاریخ ہے اور جو ہمارے آبا واجداد کی عظمت اور حشمت کی کہانی بھی ہے۔ شہر ہوں، بستیاں ہوں، آبادیاں ہوں، قصبات ہوں یا دیگر مقامات، سبھی کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ ان کے کون بانی تھے؟ ان کا کیا عروج تھا؟ کیا کیفیت تھی؟ کیا رونق تھی؟ کیا عظمت وحشمت تھی؟ کیسے کیسے خوبصورت اور عظیم الشان ایوان

تھے؟ اور کیسے کیسے قصرِ جمیل تھے؟ یہ سب اوراق پارینہ بن چکے ہیں یا پھر گمنامی کے دامن میں تحلیل ہو گئے ہیں حالانکہ ان کے آثار قدیمہ، کھنڈرات، خستہ و شکستہ در و دیوار، محلات، عالیشان مقبرے، حویلیاں، گلیاں کوچے، مساجد، پورے پورے محلے اور ان کا چپّہ چپّہ بذات خود ایک مکمل تاریخ کے ترجمان ہیں۔ بشرطیکہ آپ اپنی اور اپنے اسلاف کی تاریخ سے واقف ہوں اور ایک حساس دل رکھتے ہوں تو انہیں جگہوں کا دیدار کر کے آپکو یقین محسوس ہوگا کہ ع

محفل اجڑ گئی ہے افسانہ رہ گیا ہے

میں مورّخ نہیں، مضمون نگار نہیں، ادیب نہیں اور نہ ہی تالیف وتصنیف میرا مشغلہ ہے۔ ہاں! تاریخ سے گہری دلچسپی رکھنے کی وجہ سے کتب بینی اور مطالعہ کا شوق ضرور رکھتا ہوں۔ خاکسار ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ اپنے عزیز وطن قصبہ سانکھنی (بلندشہر) کی تاریخ مرتب کی جائے مگر اس اہم کام کے لئے ہمّت، فرصت درکار تھی۔

''میرے لئے یہ خیال اذیت بخش نہیں ہے کہ لوگ مجھے نہیں جانتے بلکہ
انتہائی تکلیف دہ وہ بات میرے لئے یہ ہے کہ میں لوگوں کو نہیں جانتا''

- کنفیوشس

چینی مفکّر کا یہ قول کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔ اس نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میں ایک خواب سے بیدار ہو گیا ورنہ میں ساری زندگی اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا کہ بے شمار لوگ تو مجھے جانتے ہیں۔ کیا ہوا کہ میں لوگوں کو نہیں جانتا۔ یہ تصوّر بڑا حسین تھا کہ میں

گمنام نہیں ہوں بلکہ ہر دل عزیز ہوں ۔اب آپ اسے میری غلط فہمی کہیں یا خوش فہمی ۔

میں ان شخصیات کو نذرانہ تشکّر تحریر کرنے میں خود کو نہایت کم مایہ اور نا اہل محسوس کر رہا ہوں جن کے تعاون ، اور حوصلہ افزائی نے میرے عزائم بلند کئے اور مجھ جیسے کم علم آدمی کو شرف مرتّبی کا اعزاز عطا فرمایا۔ میں ان الفاظ کے انتخاب کرنے سے قاصر ہوں جن کے ذریعے میں قلبی جذبات ممنونیت اور تشکّر تحریر کرسکوں ۔اس سلسلے میں چند اہم ہستیاں جیسے جناب مرزا محمد ظاہر حسین صاحب ہیڈ کلرک ، حیدری انٹر کالج سانکھنی ، جناب مرزا مجاور حسین ترابی صاحب ہیڈ مدرّس ، جناب مرزا پرویز اختر صاحب کوالٹی منیجر ،سانکھنی (حال مقیم دوبئی ، یو.اے.ای.) ، جناب مرزا مشرّف علی صاحب مدرّس اور انجینئر صاحبزادہ ہادی حسن سانکھنی ، پرسنل منیجر'مای سیارہ آٹو کیر (حال مقیم دبئی یو اے ای) جنہوں نے اپنی مصروفیت کے باوجود ان تاریخی واقعات کو قلم بند کرنے کے دوران ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی ۔ اسکے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ ممنون و مشکور ہوں اپنی اہلیہ محترمہ رضیہ زیدی اور اپنی بیٹی سُکینہ حسن کا جنہوں نے راتوں کو جاگ جاگ کر میرے قلم کو سہارا دیا۔

یہ اطمینان کی بات ہے کہ اس دور میں جب رشتے ٹوٹ رہے ہیں، قدریں بدل رہی ہیں ، اخلاق زوال حد کو پہونچ چکا ہے پھر بھی علم کے میدان میں قدریں پوری طرح پامال نہیں ہوئیں بلکہ ان کے نقوش آج بھی باقی ہیں ۔اس تشکّر نامہ کے اختتام سے پہلے میں جن عظیم شخصیات سے اظہار عقیدت و ممنونیت کے لئے الفاظ کا متلاشی رہا وہ اوّل الحاج مولانا مرزا محمد اشفاق صاحب لکھنوی ہیں ، جن کی گراں قدر محبّت کی بدولت بچپن سے

بڑھاپے تک کا سفر طے کیا۔ ۱۹۷۵ء سے لیکر تادمِ تحریر اپنے بچّے کی طرح پیار کیا۔ محترم والدین اور برادرِ عزیز مرزا مظاہر حسین مرحوم کا میرے سر سے سایہ چھِن جانے کے بعد مجھے میری یتیمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انکی گراں قدر محبت ابھی بھی قائم و دائم ہے۔ اور اب تک اُن کی شفقتیں و کرم فرمائیاں میرے لئے تسلّی و تشفّی کا باعث ہیں۔ ربّ العزت انکی عمر دراز کرے۔ آمین !

دوسرے عالیجناب سیّد انور علی زیدی صاحب ڈبائی (بلندشہر) جو کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور یونیورسٹی سے رجسٹرار کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ جس وقت خاکسار نے ۱۹۷۷ء میں یونیورسٹی میں قدم رکھا، زیدی صاحب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہم ضلع ہونے کے ناطے ہر مقام پر سہارا دیا۔ میری محنت و لگن کو دیکھتے ہوئے سروس تک پہونچایا۔ قدم قدم پر اپنے نیک مشوروں سے نوازا اور میری ہر نہج پر رہنمائی کی اور ہمیشہ میری کامیابی کی دعائیں آپ کی زبان پر رہیں۔ میں ہمیشہ ان کی دیرینہ محبّتوں کا مقروض رہوں گا۔

تاریخِ سانکھنی

سانکھنی ایک بہت قدیم ترین قصبہ ہے جیسا کہ تاریخ برن (بلندشہر) میں ملتا ہے۔ سانکھنی دہلی سے تقریباً ۱۰۵ کلومیٹر، بلندشہر سے ۳۰ کلومیٹر اور قصبہ جہانگیرآباد سے ۳ کلومیٹر اہار شاہراہ پر شمال میں واقع ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جس وقت کورو پانڈووں کی حکومت ہستنا پور پر تھی، اور وہ کندن پور (اہار) مہرسہ پر حکمراں تھے اس وقت بھی سانکھنی گاؤں کا وجود تھا کیونکہ سانکھنی میں جو قدیم مہادیو مندر ہے اسے دیکھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ اہار اونتکا دیوی مندر پر اسنان کرنے جایا کرتے تھے ان کا قیام بھی سانکھنی مہادیو مندر پر ہوا کرتا تھا۔

عہد قدیم میں اگر جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سانکھنی ہی کی طرح قریب کے گاؤں کھالور کی بھی بہت پرانی تاریخ ہے جو کہ راجہ جے سنگھ سے تقریباً تین سو سال قبل نظر آتی ہے۔ اس وقت کھالور کا نام جے سنگھ پور تھا اور کھالور کا رقبہ ۱۲۷۰ ایکڑ زمین پر مشتمل تھا، جبکہ سانکھنی کا رقبہ ۱۲۷۱ ایکڑ زمین پر مشتمل تھا۔

Bulandshahr: A Gazetteer, Being Volume V (1903)

SANKHNI, *Pargana and Tahsil* ANUPSHAHR.

A large village on the unmetalled road from Jahangirabad to Anupshahr, at a distance of two miles east of Jahangirabad and nine miles from Anupshahr. It lies on the west side of the depression known as the Nim Nadi, which passes close to the north-west of the village. Sankhni, like Khalaur, forms part of

37B

the Paikpara estate owned by the heirs of Lala Babu, a Bengali Kayasth, and with the rest of the estate is managed by the Administrator-General of Bengal. The village, which consists for the most part of mud houses, contains seven brick-built houses, six mosques, two imambaras and a temple of Mahadeo. There is a small bazar here with some thirty shops. Besides the Government school, which is attended by forty pupils, there are four indigenous schools. At the last census Sankhni contained 3,047 inhabitants, of whom 1,992 were Musalmans and 177 Aryas. The former are mainly Moghals of the Shia sect. The Hindus are chiefly Banias and Chamars. The village lands cover 1,271 acres and are irrigated from wells. The principal crops are white wheat and kusum, or safflower, but the cultivation of the latter has greatly decreased of late years. Nearly 120 acres are under groves, which lie to the east of the Nim Nadi.

گزٹ ۱۹۰۳ء

جس وقت ہندوستان چند صوبوں میں تقسیم تھا اس وقت گاؤں سانکھنی پر بنگال کی مہارانی کتّیانی کی حکومت تھی۔ مہارانی بنگال نے اپنے شوہر لالہ بابو کائستھ کو بطور لگان وصول کرنے سانکھنی بھیجا تھا۔ لالہ بابو کائستھ کا اصل نام کرشن چندر سنہا تھا لیکن وہ ہندوستان کی تاریخ میں لالہ بابو کائستھ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے علی گڑھ اور بلندشہر بمعہ دیہات مول لئے تھے۔ ۱۸۵۴ء کے گزٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سانکھنی گاؤں کو لالہ بابو کائستھ نے تقریباً ۳ ہزار روپیہ میں کسی دیگر زمیندار سے خریدا تھا جبکہ کھالور گاؤں کو ۳،۳۲۵ روپیہ

میں خرید ا گیا تھا۔ سانکھنی کی آبادی اس وقت تقریباً ۵ ہزار سے زیادہ تھی لیکن ۳۸۔۱۸۳۷ء میں جب ہندوستان میں خوفناک قحط پڑا اس خوفناک قحط کی زد میں آئے ہوئے لوگوں کو بہت بڑی مصیبت سے دو چار ہونا پڑا۔ اس قحط میں سانکھنی کے تقریباً ۲ ہزار سے زیادہ لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا، جسکے نتیجہ میں سانکھنی کی آبادی تقریباً ۳۰۴۷ رہ گئی جس میں ۱۹۹۲ رشیعہ مغل، ۷۷۱ر آرین باقی ویش (بنیے) اور جاٹو (چمار) رہ گئے۔

لالہ بابو کائستھ کے بعد تاریخ پر اگر ہم نظر ثانی کریں تو پتہ چلتا ہے کہ سانکھنی پر کچھ دن نواب ولیداد خان بھی قابض رہا کیونکہ اسکی رسائی مغلیہ دربار دہلی تک تھی اور وہ نواب مرتضےٰ خان رئیس جہانگیر آباد کا رشتہ دار تھا۔ نواب مرتضےٰ خان کے انتقال کے بعد انکے صاحبزادے مصطفےٰ خان نواب ہوئے جن کے یہاں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اور الطاف حسین حالؔی جیسے شعراء قیام کرتے تھے کیونکہ نواب مصطفےٰ خاں خود بھی اردو اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے اردو میں شیفتہؔ اور فارسی میں حسرتؔی تخلص رکھتے تھے۔ (بحوالہ تاریخ ادب اردو' رام بابوسکسینہ') بہر حال جس وقت انگریزوں سے ولیداد کا مقابلہ ہوا تو ولیداد خان نے انگریزوں کو شکست فاش دی اور قصبہ مالاگڑھ پر اس کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ علاقہ کے گوجر اور مسلمان ولیداد خان کے ہمراہ نظر آئے اسی اثناء میں ولیداد خان نے میرٹھ تا علی گڑھ کے علاقہ پر مکمل تسلط اختیار کر لیا۔ اسکے بعد اس نے اہار اور انوپ شہر کی جانب رُخ کیا۔ انوپ شہر کو راجہ انوپ رائے نے بسایا تھا جو کہ بہت نیک سیرت انسان تھا اسکے یہاں

ہند و مسلم کا کوئی کسی طرح کا فرق نہیں ملتا ہے۔ راجہ انوپ رائے نے ہی قصبہ جہانگیر آباد کی بنیاد ڈالی اور خود راجہ نے جہانگیر آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ جس وقت بادشاہ جہانگیر بغرض شکار جہانگیر آباد آیا تو راجہ انوپ رائے نے شہنشاہِ وقت جہانگیر کا بہت گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور جہانگیر کو جہانگیر آباد تحفہ میں دے دیا۔ یہ ہی ایسا دور ہے کہ گرد و نواح میں مغلوں کا آنا جانا لگا رہا اور بہت سے مغلوں نے گرد و نواح میں سکونت اختیار کر لی۔ عرصہ دراز کے بعد مغلیہ سلطنت نے جہانگیر آباد کو رشتہ داری کے عوض نواب مرتضےٰ خان کو سونپ دیا۔ جس وقت انگریزوں نے دہلی پر اپنی فتح کا پرچم لہرایا تو انہوں نے بلند شہر کی جانب رُخ کیا اور دوبارہ بلند شہر پر بھی اقتدار حاصل کر لیا۔ مالا گڑھ کے قلعہ پر بہت خوں ریز جنگ ہوئی انگریزوں نے قلعہ کو اپنے قبضے میں لیکر مسمار کر دیا۔ ولیداد خان قلعہ سے نکل کر جہانگیر آباد اہار کے راستے گنگا پار نکل گیا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انگریزوں کے ہاتھ نہیں آیا اور نیپال کی طرف نکل گیا۔ ادھر جس وقت بلند شہر پر انگریزوں کی حکومت ہوگئی تو نواب مصطفےٰ خان شیفتہؔ کو نواب ولیداد خان کی مدد کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور انکو ۷رسال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی لیکن اپیل کرنے پر نواب مصطفےٰ خان شیفتہؔ کے جرم کو معاف کر دیا گیا اور انکوان کا منصب بہ عزّت واپس کر دیا گیا۔

دوران مغل سلطنت ایرانی نسل شیعہ مغل سانکھنی میں آباد ہوئے۔ انہوں نے کاشت کاری کو فروغ دیا اور اسی دور میں ۱۶۵۵ء میں مغل مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔



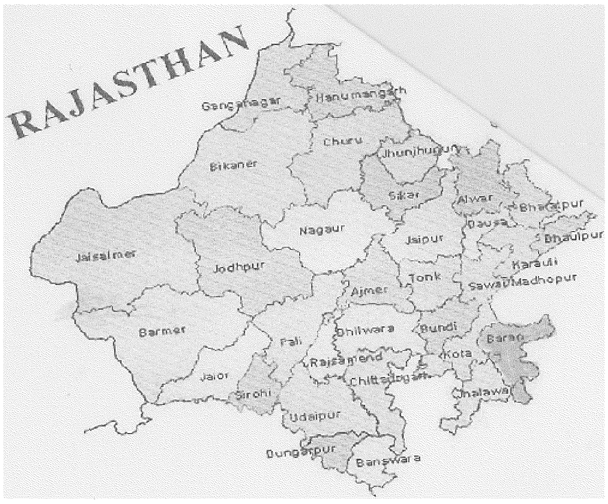
مغل جامع مسجد

وقت گزرتا رہا۔ ہندوستان کا صوبوں میں تقسیم ہونا تھا قصبہ سانکھنی بھی الگ الگ صوبوں میں جاتا رہا۔ راجہ جے سنگھ کے دور میں سانکھنی کو مارواڑ (راجستھان) میں رکھا گیا اسکے بعد بنارس میں سانکھنی کا نام آیا۔کبھی بنگال سے جوڑا گیا اور آخر میں اتر پردیش کے حوالے کر دیا گیا۔

سانکھنی، بنارس میں

Gonda district, Villages in Gorakhpur district, Villages in Hardoi district, Villages in Jalaun district, Villages in Jaunpur district, Villages in Jyotiba Phule Nagar district, Villages in Kannauj district, Villages in Kanpur Dehat district, Villages in Kanpur district, Villages in Lakhimpur Kheri district, Villages in Lalitpur district, Villages in Lucknow district, Villages in Mahamaya Nagar district, Villages in Maharajganj district, Villages in Mahoba district, Villages in Mathura district, Villages in Mau district, Villages in Mirzapur district, Villages in Moradabad district, Villages in Muzaffarnagar district, Villages in Pilibhit district, Villages in Pratapgarh district, Villages in Raebareli district, Villages in Saharanpur district, Villages in Sant Kabir Nagar district, Villages in Siddharthnagar district, Villages in Sultanpur district, Villages in Unnao district, Villages in Varanasi district, Deogarh, Uttar Pradesh, Hallaur, Baragaon, Jaunpur, Ramapur, Mankri, Dewait, Kuchesar, Gahmar, Kot, Fatehpur, Badalpur, Barabasti, Amsin, Dhanauli, Barabanki, Bera, Mathura, Chhapaiya, Basahi Banzar, Bijrol, Pelkha, Ahirauli Baghel, Nibi Gaharwar, Fatanpur, Martin Purwa, Talaspur Village, Khanzadipur, Harshpur, Khiddirpur, Mandi, Uttar Pradesh, India, Jabaranpur, Dudhara, Bishungarh, Sherpur, Ghazipur, Amrala, Lilapur, Madaraha, Gesupur, Babhanpura, Reotipur, Uttar Pradesh, Purseni, Salindh, Reoli, Belwania, Sankhni, Holipura, Nagwa, Seengemai, Karmiya, Basti, Premraja, Guraura, Nangla-Maheshwari, Baragaon,

سانکھنی، راجستھان میں



۱۸۲۴ء میں جب بلند شہر کو ضلع بنایا گیا تب سے آج تک سانکھنی کا نام بلند شہر کے مقدر سے جڑ گیا۔ ۱۸۵۷ء میں پورے ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی آواز بلند ہو گئی بہت سے حضرات سانکھنی سے ادھر اُدھر کوچ کر گئے بہت سے بیرونی حضرات نے سانکھنی میں سکونت اختیار کر لی۔ سانکھنی کی تاریخ کو جاننے اور سمجھنے کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو

پلٹنا ہوگا، جس سے حقیقت کا کچھ انکشاف ہو سکے۔

جنگ مہا بھارت کے دو تین صدیوں بعد ایک شخص راجہ اھی برن قوم تنور (تومر) نے بلندشہر آباد کیا تھا۔ بلندشہر اپنے بانی کے نام سے برن مشہور ہوا چونکہ یہ قصبہ کالی ندی کے کنارے پر گرد و نواح کے کھادر سے بہت بلند تھا اس لئے عوام میں اسکا نام اونچا نگر مشہور ہوا۔ پر مہذب زمانے میں یہ نام بلندشہر میں تبدیل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی کے حملات کے زمانے میں راجہ ہردت ڈور کا بلندشہر پر قبضہ تھا۔ ۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایک سپہ سالار سلطان شہاب الدین غوری نے جو بعد میں سلطان موصوف کا جانشین ہوا، علی گڑھ، میرٹھ، بدایوں اور بلندشہر پر قبضہ کیا اس وقت بلندشہر پر راجہ چندرسین ڈور قابض تھا۔ فوج غوری نے اسکو معہ فوج کے پامال کر دیا اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ راجہ کے خاندان کے ایک شخص مسمی اجے پال ڈور نے اسلام قبول کیا اسکو ملک محمد دراز قد کا خطاب دیا گیا اور شہر کے چوہدرات کا عہدہ معہ کچھ جاگیر کے عطا ہوا۔ سلطان محمد غوری کا فرمان بنام ملک محمد دراز قد کے اس وقت تک اس خاندان میں موجود ہے۔ یہ لوگ چوہدری ٹنٹے مشہور ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ زیادہ تر جھگڑالو تھے اس وجہ سے ٹنٹے کا لقب مشہور ہوا۔ بلندشہر کی حکومت کا عہدہ قاضی نورالدین غزنوال کو جو بادشاہ کے ہمراہ ولایت سے آیا تھا عطا ہوا۔ قاضی موصوف کے ورثاء اب تک بلندشہر میں موجود ہیں اور قاضی کہلاتے ہیں ۔ اس طرح بلندشہر سے ٹنٹے چوہدری اور قاضی حضرات اِدھر اُدھر گرد و نواح کے علاقے میں بسنے لگے کچھ افراد سانکھنی میں بھی آباد ہوئے

کیونکہ جو شاہراؤں پر لگے ہوئے دیہات تھے ان میں آنے جانے کے ذرائع بھی موجود تھے۔

تاریخ کی طرف اور آگے بڑھتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ لالہ بابو کائستھ کا جنم ۱۷۵۵ء میں بنگال میں ہوا۔ جوان ہوا تو مہارانی بنگال نے علی گڑھ بلند شہر معہ دیہات لالہ بابو کائستھ کے حوالے کر دئے۔ سانکھنی اور کھالور میں اس نے اپنی جوانی میں قدم رکھا۔ اور کچھ دن رہنے کے بعد حکومت بنگال نے سن ۱۸۰۰ء میں لالہ بابو کائستھ کو سرشتہ دار بنا کر بردبان بھیج دیا۔ جہاں ۱۸۰۹ء میں اسکا انتقال ہوگیا۔ اسکے بعد اسکا بیٹا شری نرائن سنہا یہاں کے کام کاج کو بخوبی دیکھتا رہا اس نے بدھ سین کو بلند شہر کے دیہی علاقوں کا اپنا کارندہ بنا کر بھیج دیا۔ بدھ سین سانکھنی میں ایک مکان عنایت بیگ اور مجیدن سے کرایہ پرلیکر بخوبی رہنے لگا۔ کچھ دن بعد اس نے کرایہ کے مکان کو پکا بنا لیا۔ بدھ سین کے ذریعہ مکان کو پکا بنانے پر عنایت بیگ اور مجیدن نے سیشن کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ جس کا فیصلہ عنایت بیگ اور مجیدن کے حق میں صادر ہوا۔ بدھ سین کی طرف سے مکان کا دخل حاصل نہ ہونے پر عنایت بیگ و مجیدن نے ۲۲ فروری ۱۸۹۴ء کو اپنے وکیل راج نرائن متر کے ذریعہ الہ آباد ہائی کورٹ میں دوبارہ اپیل دائر کر دی۔ اپیل کافی عرصہ تک چلی اور آخرکار ۱۹۰۴ء میں اسکا فیصلہ عنایت بیگ و مجیدن کے حق میں سنایا گیا۔ (مزید تفصیل کے لیے آگے صفحہ پر اپیل الہ آباد دیکھیں)۔

THE

Allahabad Law Journal.

Reports

OF

CASES DECIDED BY THE PRIVY COUNCIL

AND

THE HIGH COURT OF JUDICATURE

NORTH-WESTERN PROVINCES.

Editors:

SATISH CHANDRA BANERJI, M.A., LL.D.

TEJ BAHADUR SAPRU, M.A., LL.D.

Reporters:

GOKUL PRASAD, M.A., LL.B.
GULZARI LAL, B.A., LL.B.
D. OHDEDER, LL.B.
SITAL PRASAD GHOSE, M.A., LL.B.
MOHAN LAL NEHRU, LL.B.
LALIT MOHAN BANERJI, M.A., LL.B.
SARAT CHANDRA CHAUDHRI, M.A., LL.B.

VOLUME I—1904.

THE ALLAHABAD LAW JOURNAL PRESS, ALLAHABAD.

اپیل الہ آباد ہائی کورٹ

CIVIL.
1904.
RAJ NARAIN MITTER v. BUDH SEN.

and, knowing this, the latter allowed the persons so dealing to expend money in the belief that the agent had an authority which, in fact, he had not, those persons can enforce no equity against the principal. *Ramsden* v. *Dyson*, L. R., I. E and I. A., 129, followed.

Per AIKMAN, J. Where the defendant at great expense reconstructed the house he had bought, believing that he had a right to do so, and the plaintiff or his agent must have known that the defendant was spending money in this belief and yet allowed him to do so, the plaintiff could not years after the house was finished, sue for possession of the house or its removal. The dictum in *Sri Girdhariji Maharaj* v. *Chote Lal*, I. L. R., 20 All., 248 at 251, declaring a custom permitting tenants to transfer houses on village homestead land to be bad, is *obiter* and has been dissented from by more than one Judge of the High Court.

SECOND APPEAL against the decree (August 28, 1902) of F. W. Brownrigg, Esq., Officiating District Judge of Aligarh, affirming the decree (June 2, 1902) of Babu Hira Lal Sinha, Munsif of Bulandshahr.

Suit for injunction and possession.

Plaintiff was zamindar and defendants tenants of village Sankhni. On February 22, 1894, defendant No. 2 sold his dwelling-house situate in the said village to defendant No. 1, who took possession and built a *pukka* house instead. On January 24, 1902, plaintiff sued for ejectment of the defendants and demolition of the building.

Defence: (i) acquiescence on plaintiff's part, (ii) customary right of residents of Sankhni to transfer their houses at their pleasure.

The entry regarding homestead land (*abadi*) in the village *wajib-ul-arz* is translated in the judgment. The District Judge held that all that the tenants were forbidden to do by village custom was to alienate the *site*. He further held that Sankhni had "far outstripped the ordinary incidences of a merely rural hamlet." He also held that the vendee had renovoted the house at great expense, and the plaintiff's *karinda* or local agent had "looked on and never said word." The claim was "a most unfair and tyrannical one," and though a tenant could not "acquire adverse possession against a landlord as regards site, I do not see why he should not as regards a building." If the zamindar "were to claim rent only which would amply conserve his title to the land on which the house is built, his claim would not be disputed at all. But as that species of relief is not prayed for, and it is of a nature entirely distinct from that which is prayed for, it cannot be granted here." Both courts dismissed plaintiff's suit, who preferred a second appeal.

Satish Chandra Banerji (with *J. N. Chaudri*), for the appellant.

The "common law of the provinces" is that a tenant cannot alienate a house in the *abadi*.

Sri Girdhariji Maharaj v. *Chote Lal*, [1898] I. L. R., 20 All., 248.

A custom to the contrary, even if proved, would be bad in law, see *ibid*, p. 251. The entry in the *wajib-ul-arz* properly construed forbids transfers like these, and if there have been some mortgages and sales in the village the effect thereof cannot be to abrogate the custom.

CIVIL.
1904.
RAJ NARAIN MITTER v. BUDH SEN.

A landlord can always ask a house in the *abadi* to be vacated.

Punna v. *Nazir Husain*, [1902] 22 A. W. N., 60.

There could be no acquiescence in this case, because the tenant (or his transferee) all along knew or could and should have known that he was only a tenant and not absolute owner of the house in dispute.

Beni Ram v. *Kundan Lal*, [1899] I. L. R., 21 All., 496.
Ramsden v. *Dyson*, [1865] L. R., 13, I. E. and I. A., 129.

A person who has come in as a tenant or licensee of certain premises connot acquire any title therein by prescription.

Sundar Lal, for the respondents, supported the Judge's decision and contended that the rulings cited did not apply because (1) Sankhni was not an ordinary village, and (2) the plaintiff was estopped by acquiescence from claiming the reliefs sought.

C. A. V.

The following judgments were delivered by

AIKMAN, J. The plaintiff, who is appellant here, is the Receiver of an estate in the Bulandshahr district. The plaint sets forth that, on the 24th February, 1894, the second defendant, Inayat Beg, along with Musammat Mendo, deceased, now represented by the third defendant, Musammat Majidan, sold a house in Sankhni to the first defendant, Budh Sen, who has built a masonry house on the site of the purchased house, and that according to law and justice the sale and purchase were illegal and detrimental to the plaintiff's zamindari rights. The plaintiff asks to be put in possession of this masonry house; in the alternative he asks that the defendant may be ordered to remove the matertals of the house within a time to be fixed by the Court.

Aikman, J.

Amongst other plea, put forward by the answering defendant, Budh Sen, he alleged that he had built the new house nine years previously, that the plaintiff had acquiesced in the construction;

CIVIL.
1904.
RAJ NARAIN MITTER v. BUDH SEN,
Aikman, J.

that Sankhni is not a village but a town; that the inhabitants thereof were owners of their respective houses and that it had always been the custom among the residents to make transfers of their houses.

The court of first instance dismissed the suit. The plaintiff appealed. His appeal was dismissed by the learned District Judge, and he comes here in second appeal.

Reliance is placed on paragragh 2 of a *wajib-ul-arz* framed at the penultimate settlement in 1870. The learned Judge says "no such record was framed for this district at the last settlement." It is not clear what is meant by this. Possibly what the learned Judge means is that no similar provision is to be found in the village administration paper prepared at the last settlement. The paragraph relied on begins as follows:—"Without any (our?) consent no body can settle in any place possessed by us." This is no doubt intended to prevent strangers settling in the village without the zamindar's permission. With reference to this, it has to be borne in mind that the answering defendant is not a stranger but a resident of Sankhni.

The paragraph proceeds:—"A ryot occupying any house cannot be turned out of it by any body so long as he lives in it, but he is not empowered to alienate the site. He can remove and sell the materials of the building constructed by him."

The answering defendant does not claim to have acquired any proprietary title to the site; he does not dispute the plaintiff's right to recover ground-rent for the site, and this is all the learned Judge has held the plaintiff to be entitled to.

As I read the clause relied on by the plaintiff, it does not prohibit the transfer of a house by one resident of the village to another.

The learned Judge finds that from 1870 onwards, sales and mortgages of house property have been going on uninterruptedly in Sankhni, and have never been objected to before. For the appellant reliance is placed on a passage in the judgment in the case *Sri Girdhariji Maharaj* v. *Chote Lal* (1). The passage relied on is an *obiter dictum*, which has been dissented from by more than one Judge of this Court. There is, I think, no manner of doubt that the defendant, Budh Sen, believed he had acquired a good title to the house, and that, acting on this belief, he expended a large sum of money "variously put at anything from Rs. 6,000 to Rs. 10,000." The learned Judge observes "There is no doubt whatever that the erection of this fine house was acquiesced in by the plaintiff." To

(1) [1898] I. L. R., 20 All., 248.

CIVIL.

1904.

RAJ NARAIN MITTER v. BUDH SEN.

Aikman, J.

this finding no objection is taken in the memorandum of appeal to this court. It is merely contended that the fact of the zamindar not objecting to the erection of the house will not affect his right to recover possession of the site by ejectment of the defendants.

The defendant at great expense reconstructed the house he had bought, believing that he had a right to do so. The plaintiff or his agent must have known that the defendant was spending his money in this belief, and yet allowed him to do so. Years after the house is finished, the plaintiff without making any attempt to explain the delay comes to court, and sues for possession of the house or for its removal. In the well-known case, *Ramsden v. Dyson and another* (1) the Lord Chancellor says at p. 140, "If a stranger begins to build on my land supposing it to be his own, and I, perceiving his mistake, abstain from setting him right, and leave him to persevere in his error, a Court of Equity will not allow me afterwards to assert my title to the land on which he had expended money on the supposition that the land was his own. It considers that, when I saw the mistake into which he had fallen, it was my duty to be active and to state my adverse title; and that it would be dishonest in me to remain wilfully passive on such an occasion, in order afterwards to profit by the mistake which I might have prevented."

Applying the principle embodied in these observations to the facts of the present case, I have no hesitation in coming to the conclusion that the plaintiff is not entitled to either of the reliefs he asks for, and that his suit has been rightly dismissed.

I would dismiss this appeal with costs.

Knox, A. C. J.

KNOX, A. C. J. The questions raised in this second appeal are questions of no small importance.

They relate to the rights of land-holders in village homestead land and how far those rights may be affected by omission on the part of a local agent to assert his principal's rights when infringed by any act of the tenant.

The lower appellate court in its judgment sets out the facts and they may be taken to be as follows :—

The plaintiff-appellant is receiver of the estate of one Lala Babu, one of the landlords of the village Sankhni. The learned Judge tells us that "the homestead of this village lies about two miles from the town of Jahangirabad and has itself many urban properties. Several wealthy people live there and it has far outstripped the

(1) [1865] L. R., I E. and I. A., 129.

CIVIL
1904.
RAJ NARAIN MITTER v. BUDH SEN.
Knox, A. C. J.

ordinary incidents of a merely rulal hamlet." This last fact stated by the Judge is open to question. The only authority I can find for it is the statement made in para. 9 of the written reply, which runs as follows :—Sankhni is not a village but a town. The zamindar has no right to the *abadi* of it. It has always been the custom among the residents of the village to make transfers, &c." The point was not put in issue and I find it difficult therefore to apprehend and to appraise the precise nature and force of the learned Judge's remark. It is easy to write "*currente calamo*" about a village as having far outstripped the ordinary incidents of a merely rural hamlet, but when we have to consider rights of property, something more definite is required showing in what direction and to what extent the incidents of a merely rural hamlet have been outstripped.

There is the tangible fact that in 1870 it was treated by the Settlement Officer as an ordinary *mahal* and the Record of Rights then drawn up was just such as would be drawn up for any ordinary *mahal*. I therefore prefer to deal with Sankhni as an ordinary *mahal* governed to all intents and purposes by the laws and customs which govern *mahals* in these provinces. It is for those who wish to take it out of this category or to maintain that it is governed by special local customs to establish such exceptions to the ordinary rule.

To resume the facts. The plaintiff asks (1) to be put into proprietary possession of a certain house of which Budh Sen is in occupation ; (2) that the said defendant, Budh Sen Bakkal, be ordered to remove the materials of the house within a time to be fixed by the Court ; (3) that if he fail to do so, his right so to remove them may be declared extinct.

The house in dispute originally belonged to the respondents, Inayat Beg and Musammat Majidan, and to their predecessors in interest. They have been mortgaging it for many years to various persons and eventually they have sold it to Budh Sain, the respondent, under a sale deed dated the 22nd of February, 1894, some six years or more before the present suit was instituted.

"Budh Sen," the learned Judge finds, "set about renovating the house. He spent a lot of money on it" until the value according to a commissioner (the Tahsildar) appointed in the case for the purpose of ascertaining its value, is estimated at Rs. 6,000. While this renovation was being carried out plaintiff's *karinda* "looked on and never said a word." He, the learned Judge, adds, "practically acquiesced in the improvements made by Budh Sen." It is not

easy to apprehend to what this practical acquiescence amounts in fact; it is an acquiescence gathered from either the act or the omission of the *karinda*, it is not said which, and the *karinda* is *karinda* to a principal who was at the time apparently a minor of very tender years (*vide* para. 5 of the plaint). He was a minor in 1889 and was still a minor in 1902. Apparently he is still a minor. The receiver of his estate is a Barrister residing in Calcutta. And the *karinda* is a person appointed by the Barrister under a special power of attorney which is on the record. The vendee apparently finished his building by 1896.

CIVIL.

1904.

RAJ NARAIN MITTER *v.* BUDH SEN.

Knox, A. C. J.

The situation then briefly is this. Certain cultivators have sold a house situate in the homestead of Sankhni to a bunyah. The bunyah has spent sums of money on it. The land-holder is a minor and the *karinda* of receiver of his estate appointed by the Court by act or omission has practically acquiesced. Can the land-holder ask to be put in possession of the house or ask that the materials be removed?

In considering this question it is necessary to see first what are the generally recognized powers of a landholder in these provinces over homestead land in a village.

I find on turning to the "Land Systems of British India" by B. H. Baden-Powell, C.I.E., an officer who had great experience in these matters both as a Collector and afterwards as a Judge of the Chief Court of the Punjab, the following, which accords with what my observation and experience leads me to believe is the custom ordinarily prevalent in the case of village homesteads in these provinces The following extract is from page 154 of his work :—

"The village site (he is writing of homesteads in the United Provinces) is owned by the proprietary body, who allow residences to—

(1) The 'kamin,' the artisan class, farm-labourers, and menials.

(2) The tenantry.

(3) The traders, money-lenders, &c.

"These probably pay some small dues, according to custom; and if they leave the village, may have no right to dispose of the site, and only in some cases to remove the roof, timber and other materials." Again, at page 107 I find "the site on which the village habitations, the tank, the grave-yard, and the cattle-stand are, is claimed by them; and the others live in and use it only by permission—perhaps on payment of small dues to the proprietary body."

This Court in the Full Bench case, *Chajju Singh v. Kanhia* (1),

(1) [1881] 1 A. W. N., 114.

CIVIL.
1904.
RAJ NARAIN MITTER v. BUDH SEN.
Knox, A. C. J.

laid down that "the zamindars of a village are, as a rule, and presumably, the owners of all the house-sites in their villages, and a house left unoccupied by a tenant lapses to the landlord in the absence of heirs or other lawful assignees of the last occupant."

The terms recorded in the *wajib-ul-arz* in this very village, so late as 1870, point to this custom being known and recognized in Sankhni. They are as follows:—

"Paragraph 2.—Mention of homestead. * * * *
Without our consent no body can settle in any place possessed by us. A ryot occupying any house cannot be turned out of it by any body so long as he lives in it, but he is not empowered to alienate the site. He can remove and sell the materials of the building constructed by him."

Assuming this to be a correct representation of the rights of landholders in any normal village in these Provinces and remembering the force which attaches to a *wajib-ul-arz*, I hold that the "sales and mortgages of house property" which have according to the Judge been going on uninterruptedly in Sankhni for many years back from 1870 onwards, are of no value as establishing a custom to the contrary. They are at the best only evidence of so many special contracts in so many specific instances of transfer and nothing more.

The rights of tenants to sell houses which they had built for their occupation in a village homestead upon permission given by the zamindar was considered by a Bench of this Court in *Sri Girdhariji Maharaj v. Chote Lal and others* (1). In that case one Chote Lal had purchased at auction sale under a decree the rights of occupiers of a house in the *abadi* and the zamindar sued for possession. This court, relying upon what it held to be "the general and well-known custom of these Provinces, a custom so well established that it might be treated as the common law of the Provinces," held that a person, agriculturist or agricultural tenant, who is allowed by a zamindar to build a house for his occupation in the *abadi* obtains, if there is no special contract to the contrary, a mere right to use that house for himself and his family so long as he maintains the house and does not abandon it by leaving the village. They added that as such occupier he has, unless he has obtained by special grant from the zamindar, no interest which he can sell by private sale except his interest in the timber, roofing and wood-work of the house. They accordingly granted the zamindar or landholder a decree declaring (1) that "the occupiers of the house had no right except to the timber, the wood-work and the roofing, which could

(1) [1898] I. L. R., 20 All., 248.

CIVIL.

1904.

RAJ NARAIN MITTER v. BUDH SEN.

Knox, A. C. J.

be sold in execution of a decree against them; (2) that a right to occupy the house was not transferable by sale, either private or in execution of a decree, and also a decree that the plaintiff be put in possession of the site claimed. Chote Lal was allowed thirty days to remove such of the materials of the house as were not part of the land; and it was added that he could not remove the walls of the house if they were constructed of soil belonging to the village."

The attention of the learned Judge was called to this ruling, but he refused to follow it holding that the deeds of sale and transfer which had been filed showed that Sankhni was not a small country hamlet to which any unwritten common law of the country can be held to apply. I am unable to follow the learned Judge in this reasoning. The *wajib-ul-arz* testifies to the contrary.

He, however, further holds that the appellant is barred by acquiescence from claiming this relief and that it would be inequitable to grant it. This view is challenged by the appellant.

It will be necessary to examine somewhat closely the conduct of the plaintiff or rather that of his agent in order to decide whether that conduct in the present case does amount to such acquiescence as would estop the plaintiff from the relief he claims, and in connection with this it will be well to bear in mind what has been laid down by Lord CRANWORTH in the case of *Ramsden* v. *Dyson* (1) at p. 158: —"If, indeed, the principal knows that persons dealing with his agent have so dealt in consequence of their believing that all statements made by him had been warranted by the principal, and, knowing this, allows the persons so dealing to expend the money in the belief that the agent had an authority which, in fact, he had not, it may be that in such a case a Court of Equity would not allow the principal afterwards to set up want of authority in the agent. But this equity, whenever it exists, defends absolutely on the fact that the knowledge on which it rests can be brought home to the principal." In the present case I cannot lay my finger upon any act of the agent. All that I can find is that while Budh Sen spent the money, the agent looked on and never said a word. There is nothing to show that Budh Sen ever enquired or had any reason to believe that this agent had authority to allow his principal's rights to be given away or that any statement of the agent (no such statement is set up) was warranted by the principal.

The powers which are conferred upon this agent have been set out in his power of attorney. I have had this document read over to me. It is a carefully prepared and guarded document, and I can

(1) [1865] L. R., I. E. and I. A., 129.

CIVIL.

1904.

RAJ NARAIN MITTER *v.* BUDH SEN.

Knox, A. C. J.

find nothing in it on which to base an inference that the agent had any power to give away any rights of his principal, indeed there is one clause which expressly sets out that the principal will not be responsible for any acts of the agent in excess of the power conferred by the deed.

To hold that the property of or rights in the property of an absentee minor could be given away by an agent looking on and allowing a tenant to spend money is a step I cannot bring myself to take.

کلکتہ

I regret exceedingly to find myself differing from my learned brother. I can find no ground on which to base the inference that the plaintiff must have known the defendant was spending money in the belief that he had a right to do so. The plaintiff resides in Calcutta and it is not shown that he ever came near Sankhni. The probabilities are the other way. There is nothing to show that any news of the defendant's act was ever conveyed to him. If we consider probabilities they lean quite as much to the defendant stealing a march upon an absentee landlord, but I prefer to base my judgment upon the facts. Upon them I am constrained to hold

1st.—That it has not been shown that the right of landholders in the homestead in mauza Sankhni differ in any respect from what are the general and customary rights prevalent in these provinces.

2nd—That the respondent, Inayat Beg and Musammat Majidan, could not transfer to the respondents, Budh Sen, anything further than the materials, &c., of the house which Inayat Beg and Musammat Majidan occupied as tenants.

3rd—That it has not been shown that the landholder knew or acquiesced in the building erected by Budh Sen.

4th—That the landholder's agent had no authority to do any act signifying such acquiescence on his principal's behalf.

For these reasons I would allow the appeal, but as the judgment of the Court must be that of my learned brother, I need not set out what in my opinion should be the relief granted.

BY THE COURT. The order of the Court is that the appeal be dismissed with costs.

S. C. B. *Appeal dismissed.*

جس وقت لالہ بابو کائستھ نے سانکھنی کو خریدا تھا اس وقت سانکھنی ایک گاؤں تھا اور جس وقت بدھ سین کو حکومت بنگال نے لالہ بابو کو کارندہ بنا کر بھیجا تب تک سانکھنی ایک قصبہ بن چکا تھا۔ برطانوی حکومت نے ۱۸۷۰ء میں یہ قانون پاس کیا کہ جن زمینداروں نے گاؤں خریدے تھے اور اب قصبہ بن چکے ہیں ان زمینداروں کے دیہاتوں سے اختیارات ختم ہو چکے ہیں کیونکہ اس وقت سانکھنی ایک گاؤں نہیں بہت پرانا قصبہ ہے اس لئے حکومت برطانیہ کے قانون کے مطابق کسی بھی زمیندار کو آبادی میں پکا مکان بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

۱۹۳۰ء کے گزٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ سانکھنی میں کل ۷ پکّے مکانات تھے باقی مکانات مٹّی کے بنے ہوئے تھے۔ یہاں پر دو امام بارگاہ، ٦ مساجد تھیں اور ایک مہادیو جی کا مندر تھا، ایک بازار تھا جس میں ۳۰ دکانیں موجود تھیں ایک گورنمنٹ اسکول تھا جس میں ۱۴۱ بچّوں کا اندراج تھا۔ علاوہ ازیں ایک پرائمری اسکول لڑکوں کے لئے تھا جس میں ۵۴ بچّوں کا اندراج تھا اور ایک پرائمری اسکول لڑکیوں کے لئے تھا جس میں ۲۹ لڑکیوں کا اندراج تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ڈاکخانہ بھی کافی عرصے سے موجود تھا۔

List of schools.

Serial number.	Name of school.	Number of pupils on 31st December, 1921.
	Town schools.	
1	Bulandshahr ..	158
2	Gulaothi	102
3	Siyana	84
4	Shikarpur	96
5	Anupshahr	77
6	Dibai	63
7	Jahangirabad ..	122
8	Khurja	71
9	Jewar	80
10	Sikandrabad	79
11	Dankaur	66
12	Dadri	32
13	Mission School, Bulandshahr.	32
14	School of untouchables ..	4
	Girls' schools.	
1	Anupshahr	46
2	Sankhai	29
3	Waira Firozpur ..	27
4	Siyana	44
5	Bhon	28
6	Dankaur	24
7	Kakore	26
8	Jahangirpur ..	33
9	Jewar	37
	Primary schools.	
1	Ahmadnagar	70
2	Aurangabad	45
3	Banbpur	45
4	Banhoi	83
5	Bagrasi	64
6	Baroli	70
7	Bhatona	75
8	Bhon	141
9	Bihra	71
10	Chitson	68
11	Chandaukh	60
12	Jouli	65
13	Jalalpur	33
14	Kotah	75
15	Kailawan	40
16	Loharka	54
17	Malagarh	70
18	Manglore	78
19	Mirzapur	43
20	Nisrakh	44
21	Amka	72
22	Nosana	87
23	Naithla	77
24	Sarai Chhabila ..	64
25	Sathla	85
26	Saidpur	111
27	Sega	50
28	Sihi	70
29	Waira Firozpur ..	93
30	Wairi	40
31	Ghungraoli	75
32	Hartauli	44
33	Machkauli	57
34	Shikarpur Branch ..	126
35	Gulaothi do. ..	120
36	Bulandshahr ..	144
37	Siyana	139
38	Utrauli	53
39	Agauta	50
40	Mandauna	50
41	Kalauli	53
42	Kisaula	64
43	Kurli	57
44	Chitsona Alipur ..	38
45	Charawak	66
46	Kamalpur	46
47	Badha B zidpur ..	48
48	Putha Kabulpur ..	40
49	Olenda	33
50	Sikhera	22
51	Sentha	3
52	Makri	23
53	Darwaishpur ..	17
54	Harthla	19
55	Ganora Zumiardar ..	20
56	Bhainsauli	31
57	Dasehra	39
58	Salempur	25
59	Jalalpur Korira ..	20
60	Rangpur	18
61	Bisundra	28
62	Rahmanpur Sioli ..	25
63	Asaori	24
64	Guthaoli	22
65	Daryapur	10
66	Osafabad	16
67	Maman	21
68	Kuchesar	26
69	Ajitpur	15
70	Shahnagar	24

List of schools.

Serial number.	Name of school.	Number of pupils on 31st December 1921.	Serial number.	Name of school.	Number of pupils on 31st December, 1921.
	PRIMARY.—(*continued*).			PRIMARY.—(*continued*).	
71	Chhaprawat	45	118	Khandoi	39
72	Sehra	29	119	Unchagaon	45
73	Mahabatpur Garhi ..	36	120	Talwar	25
74	Thal Enayatpur ..	33	121	Bhagwantpur ..	18
75	Khakunda	20	122	Rahimkot	12
76	Mursona	6	123	Chondhera Kila ..	17
77	Bohach	16	124	Moharsa	25
78	Khad	34	125	Shikoi	27
79	Piyana	23	126	Tauli	31
80	Hajipur Bhatola ..	34	127	Khadana	22
81	Waira Firozpur School of untouchables.	24	128	Bansri	28
82	Siyana night school ..	30	129	Sultanpur Niloni ..	18
83	Siyana school of untouchables.	40	130	Akbarpur	18
84	Nayabas school of untouchables.	15	131	Kaser Kalan	9
85	Amargarh	60	132	Badhpura	26
86	Danpur	56	133	Narora	35
87	Belon	57	134	Raghnathpur ..	30
88	Daulatpur Ahar ..	17	135	Giraura	26
89	Ditto Dibai ..	51	136	Dharakpur	24
90	Dharampur	54	137	Unchagaon	10
91	Guraoli	60	138	Parwana	70
92	Jadol	50	139	Basi	25
93	Jatpura	80	140	Indore	23
94	Jargawan	48	141	Nagla Imrat ..	26
95	Khonpur	61	142	Aterna	76
96	Katiole	61	143	Ahmadgarh	52
97	Karanbas	49	144	Bartauli	62
98	Khalour	89	145	Badha	44
99	Malakpur	80	146	Chingraoli	75
100	Makhana Surajpur ..	49	147	Chaundhera ..	51
101	Nabinagar	70	148	Fazailpur	54
102	Narsena	50	149	Jahangirpur ..	110
103	Parli	50	150	Karora	100
104	Sonkhni	54	151	Bonali	68
105	Umarpur	58	152	Kairola	80
106	Ahar	29	153	Munda Khera ..	67
107	Ramghat	57	154	Pindrawal	43
108	Dibai branch ..	123	155	Pahasu	100
109	Anupshahr branch ..	131	156	Rabupura	86
110	Jahangi rabad ..	224	157	Ranehra	65
111	Bibiana	19	158	Surjaoli	51
112	Bhirauli	54	159	Thora	83
113	Ladana	45	160	Nagla Karauli ..	52
114	Soharkha	46	161	Mirpur	58
115	Bagsara	49	162	Muni	44
116	Rampur	46	163	Zewar branch ..	175
117	Mowai	43	164	Khurja training ..	99
			165	Khurja Sarai Nasarullah Khan.	87

List of schools.

Serial number.	Name of school.	Number of pupils on 31st December, 1923.	Serial number.	Name of school.	Number of pupils on 31st December, 1923.
	Aided Schools—(*contd.*).			**Aided Schools—(*contd.*).**	
10	Surkhru	21	31	Sonaitha Shafipur ..	23
11	Aqapur Tiana ..	25	32	Mohana	28
12	Posra	24	33	Batta	23
13	Bulandshahr school of untouchables.	50	34	Khwajapur	25
14	Church Mission School, Bulandshahr.	110	35	Ritauli	27
15	Ramghat	41	36	Missiri	24
16	Khanoda	22	37	Dibai	38
17	Hatewa	28	38	Belon	30
18	Mission School, Jahangirabad.	26	39	Arnia	28
19	Anibas	22	40	Thora	18
20	Pharakna	44	41	Piaoli	22
21	Rustampur	18	42	Jhajhar	19
22	Chorauli	31	43	Gonara Sheikh ..	28
23	Nimka	22	44	Bugrasi	47
24	Dalpatpur	25	45	Sankhni	41
25	Nagar	29	46	Dibai	61
26	Lalner	30	47	Khanpur	30
27	Gotthni	32	48	Birora	35
28	Firozpur	25	49	Poor School, Sikandrabad	51
29	Agora	30	50	Juma Masjid do.	51
30	Ramgarh ..	20	51	Delhi Darwaza do.	61

xxxiv

Bulandshahr District.

List of Post Offices.

1. Amarpur.
2. Aurangabad.
3. Balka.
4. Chola R. S.
5. Daulatpur.
6. Daryapur.
7. Hatimabad.
8. Khanpur.
9. Lakhaothi.
10. Lalkua.
11. Malagarh.
12. Muqimpur.
13. Pali.
14. Pandrawal.
15. **Sarai.**
16. Sihanpur Fort.
17. **Anupshahar.**
18. Jaroli.
19. Malikpur.
20. **Bilaspur.**
21. Kasna.
22. **Bulandshahr Kuetchery.**
23. **Chatari.**
24. Chondhera.
25. **Dadri.**
26. Dhoom.
27. Jarcha.
28. Piaoli.
29. Surajpur.
30. **Dankaur.**
31. **Deputyganj.**
32. **Dibai.**
33. Danpur.
34. Dharampur.
35. Kaserkalan.
36. **Gulaothi.**
37. Barkatpur.
38. Saidpur.
39. **Jahangirabad.**
40. Ahar.
41. Chandauk.
42. Sankhni.
43. **Jewar.**
44. Jahangirpur.
45. Thora.
46. **Jhajhar.**
47. Kakore.
48. Rabupura.
49. **Khurja.**
50. Arnian.
51. Greosganj.
52. Mundakhera.
53. **Naraura.**
54. Ramghat.
55. **Pahasu.**
56. **Rajghat.**
57. Karanbas.
58. **Shikarpur.**
59. Ahmedgarh.
60. **Sikanderabad.**
61. Chhola.
62. Gurukul Sikandrabad.
63. Wair.
64. **Siyana.**
65. Bagrasi.
66. Kuchesar.
67. **Sathla.**

N.B.—The names of sub-offices are in **bold type** and the rest are branch offices.

قصبہ سانکھنی عہد قدیم سے تجارت کا مرکز رہا ہے جہاں جہاں ہندوستانی لوگ برطانوی حکومت کے زیادہ مخالف نظر آئے وہاں وہاں پر برطانوی حکومت نے بستیوں کے رہنے والوں کو مشکلوں سے دوچار کرنے کے لئے نیل کی کاشت کرائی جس کا جیتا جاگتا ثبوت سانکھنی میں چہار جانب نیل کی کاشت کے نشانات آج بھی موجود ہیں جن کو علاقائی عام زبان میں ''چاہ بچّہ'' کہا جاتا ہے کیونکہ مغربی ممالک میں نیل کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان میں بھی نیل کی کاشت کو کافی اہمیت دی۔ اور یہاں سے نیل کو تیّار کرنے کے بعد برطانیہ حکومت اسکو مختلف رنگ دیکر مختلف کپڑوں کو رنگنے کے قابل بناتی تھی اور اس کو دنیا کی مختلف بین الاقوامی منڈیوں میں اچھّی قیمت پر فروخت کرتی تھی۔ نیل کی کھیتی نے ہندوستانی لوگوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا کیونکہ نیل کی کھیتی میں محنت بہت زیادہ تھی۔ جبکہ مزدوری بہت غیر معمولی طور پر محصول ہوتی تھی۔ جسکو اہل سانکھنی اونٹوں کے شکرم میں کابل کندھار، اور پشاور تک لے جایا کرتے تھے کچھ حضرات گردونواح میں گھوڑوں سے تجارت کرتے تھے جن کو جھوجا کہا جاتا تھا یہ لوگ پندرہ پندرہ اور بیس بیس یوم میں اپنے گھر واپس لوٹتے۔ اس کے علاوہ بلندشہر گزٹ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نیل کی کاشت کے علاوہ گیہوں اور کُسُوم کی کاشت بھی سانکھنی میں پیداوار کا ایک اہم حصّہ تھی۔

اس کے علاوہ جھوجھوں کی تاریخ کے بارے میں ''تاریخِ ضلع بلندشہر (۱۸۷۴)'' میں کنور لچھمن سنگھ ڈپٹی کلکٹر صفحہ نمبر ۳۸۷ پر بیان کرتے ہیں کہ:

''نومسلموں میں قوم جھوجھہ زیادہ تر قابلِ تذکرہ کے ہے اس قوم کے لوگ ضلع بلندشہر میں پانچ گاؤں مسلّم کے زمیندار اور چھ گاؤں کے حصے دار ہیں بعضے اپنا گوت مغل بعضے ترک' بعضے راجپوت برہمن بتلاتے ہیں لفظ جھوجھہ کی وجہ تسمیہ بہت مشتبہ ہے۔ بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ کسی زمانے میں رزیل قوموں کے دیہاتی مسلمان بیئے کے گھونسلے یعنی جھونج لیجا کر دہلی میں لڑکوں کے کھیلنے کے واسطے بیچ آیا کرتے تھے، اس واسطے اوّل ان کا لقب جونجیا پڑا وہی بگڑ کر جھوجھا ہوگیا کوئی کہتا ہے کہ یہ لوگ اولاد اُن عورتوں کی ہیں جو اُمراء دہلی کے لڑکوں کو دودھ پلانے کے واسطے نوکر رکھی جاتی تھیں اور چھچی کہلاتی تھیں کسی کا قول ہے کہ لوگ لڑاکو زیادہ تھے اور لڑائی کو ہندی میں جوجھ کہتے ہیں اس واسطے ان کا لقب جھوجھہ ہوا۔ ایک یہ بھی روایت ہے کہ ان لوگوں کا پیٹ اکثر بدنما مثل جھونج کے ہوتا تھا اس واسطے عوام ان کو جھوجھہ کہنے لگے۔ غرض کہ جھوجھوں کی قوم ادنیٰ سمجھی جاتی ہے ان کی رشتہ داری کو نہ اعلیٰ قوم کے مسلمان قبول کرتے ہیں نہ نومسلم' نہ یہ ہندوؤں کی کسی رسم کو مانتے ہیں نہ مسلمانوں کی۔ پردہ داری کے پابند ہیں عمدہ صفت ان میں یہ ہے کہ کھیتی کے کام میں بہت محنتی ہوتے ہیں مثل مشہور ہے'' کہ جھوجھا ہالی راکھ کے گھر بیٹھا چوسر کھیل'' یعنی جس شخص نے ہل جوتنے کے واسطے کسی

جھوجھہ کو نوکر رکھ لیا اس کو کچھ فکر کرنے کے ضرورت نہیں ہے۔''

اس سے قبل صفحہ ۳۷۸ پر بھی بیان کیا گیا ہے کہ:

''کچھ جھوجھے بھی مغل کہلاتے ہیں لیکن ان کی نسبت یہ روایت ہے کہ کسی مغل امیر نے ارزل قوم کے ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا انھیں کی اولاد یہ جھوجھے ہیں اور چونکہ مغل کے ہاتھ سے مسلمان ہوئے اس واسطے مغل کہلاتے ہیں۔ جھوجھہ مغلوں میں موضع سانکھنی پرگنہ انوپ شہر اور موضع کمال پور پرگنہ برن کے جھوجھے مقدم ہیں ان لوگوں سے نہ خالص مسلمان رشتے داری کرتے ہیں نہ راجپوت مسلمان بس یہی ایک دلیل ان کے ادنیٰ قوم ہونے کی نشانی دی جاتی ہے۔''

سانکھنی پر کیا کیا نہ ظلم ہوئے۔ کبھی لالہ بابو کی حکومت، کبھی ولیداد خان کی حکومت اور کبھی انگریزوں کی حکومت، جن کے بوٹوں کی آوازیں آج بھی کانوں میں گونجتی ہیں جو اسلحہ کی تلاش میں بوٹ پہن کر مساجد کی تلاشی لیا کرتے تھے۔ آخر میں بنیوں کی حکومت سانکھنی میں رہی جن کے ظلم وستم سے بستی کے مسلمان برباد ہوئے۔ لالہ کھمانی داس جو سانکھنی کا تانہ شاہ تھا وہ بہت ہی ظالم و جابر اور بدکردار بے رحم انسان تھا۔ مسلمانانِ سانکھنی کے ساتھ لعن طعن بھرے لہجے میں گفت وشنید کرتا تھا۔ دراصل مسلمانانِ سانکھنی کے اقتصادی حالات بہت کمزور تھے، کمزور حالات کی وجہ سے انکی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ انکے اقتصادی حالات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانانِ سانکھنی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ ظلم کے پاؤں کبھی

ٹھہرتے نہیں ہیں ایک دن بستی کے مرزا اصغر حسین عرف اصغری اور مرزا عارف حسین عرف عرفہ نے اپنے سر سے کفن باندھ ہی لیا کافی جدّ و جہد کے بعد نتیجہ صفر نکلا لیکن مسلمانانِ سانکھنی نے ہمّت نہیں ہاری۔ لالہ کھمانی داس کی زیادتیوں نے اور زور پکڑ لیا۔ آخر کار لالہ کھمانی داس کی تانہ شاہی اور زیادتیوں سے پریشان ہو کر مولّف کے دادا مرزا ہادی بیگ نے سر پر کفن باندھ کر ان کو نیست نابود کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ جس میں مرزا ہادی بیگ پوری طرح کامیاب ہوئے۔ ایک تانہ شاہ کا سانکھنی چھوڑنا تھا کہ رفتہ رفتہ سانکھنی سے بنیوں کی حکومت ختم ہوگئی اور وہ گرد و نواح میں آباد ہو گئے۔ آج اگر ہم سانکھنی کی پر فضا میں سکون کے ساتھ سانس لے رہے ہیں تو یہ ہمارے نیک سیرت بزرگ مرزا ہادی بیگ کا ہی نتیجہ ہے۔

قصبہ سانکھنی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اسکی سر زمین سے بہت سے شعراء، اساتذہ، ڈاکٹر، انجینئر اور علماء وغیرہ نے جنم لیا ہے (جن کا تفصیلی تذکرہ آئندہ کیا جائیگا)، اسی سر زمین نے مرزا یونس علی قلندر کو جنم دیا۔ جن کو ضلع میں کافی عزت بھری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر وقت انکے آستانہ (گاندھی چوک، بلندشہر) پر پیر و مرشد اور صوفیائے کرام کا تانتہ بندھا رہتا تھا انکے تصوّف سے متاثر ہو کر ایک انگریز افسر نے ان کو بطور انعام دونالی بندوق سے سرفراز کیا تھا۔

ہندوستان کی سر زمین پر سانکھنی کی عزاداری کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ایّامِ عزاء کے دوران سانکھنی کی تمام، مستورات بھی مجلس و ماتم میں منہمک رہتی ہیں جس سے دورانِ ایّامِ عزا گھر کے در و دیوار سے مجلس و ماتم و گریہ و زاری کی صدائیں بلند ہوتی رہتی

ہیں ۔مغربی یو پی کی کوئی شیعہ بستی ایسی نہیں جہاں شب بیداری اور جلوس میں انجمن حیدری سانکھنی (رجسٹرڈ) شریک نہ ہوتی ہو ایک عرصہ سے انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے دہلی، بجنور، آگرہ، الہ آباد، نوگانواں سادات، امروہہ، سنبھل، رام پور، مظفرنگر، بریلی، میرٹھ اور گردونواح وغیرہ میں اپنی مقبولیت کا لوہا منواتی رہی ہے، جس کا اصل مقصد مومنین حضرات کو کربلا کے واقعات اور آئمہ معصومینؑ کی سیرت کی طرف متوجہ کرانا ہے ۔ جہاں تک انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی کی نوحہ خوانی کا تعلق ہے وہاں نوحہ کی دنیا میں استاد اکبرحسین مرحوم کے عزیز شاگرد مرزا چاند بیگ فیضی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ۔ ان کو نوحہ خوانی کے میدان میں ایک انفرادی مقام حاصل ہے، جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی اپنی پرسوز آواز میں نوحہ خوانی فرماتے رہتے ہیں اگران کے لئے یہ شعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

مجھے لمحے نہیں صدیاں سنیں گی
سلامت تم مری آواز رکھنا

مرثیہ گوئی میں مرزا علی عرف بھورے میاں نے اپنی آواز کے جادو سے مرثیہ میں ایک نئی روح پھونکی انھوں نے ایک نئی طرز پر مرثیہ پڑھنے کی بنیاد رکھی ۔مرزا علی نے اپنی حیات میں میرانیسؔ، مرزا دبیرؔ کے بہت سے مراثی پڑھے ۔اس ڈیجیٹل دور میں سانکھنی کی سر زمین پر انھیں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا ۔

تعارف بلندشہر

جنگ مہا بھارت سے قبل بلند شہر ''بن چھٹی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جیسا کہ تواریخ میں ملتا ہے۔ چہار اطراف جنگل ہی جنگل تھا۔مہا بھارت سے دو تین صدی بعد ایک راجہ اھی برن قوم تنور (تومر) نے بلندشہر کو آباد کیا۔ بلندشہر اپنے بانی کے نام سے 'برن' مشہور ہوا جو کہ آج تک سرکاری کاغذات میں برن لکھا جاتا ہے۔ چونکہ یہ قصبہ کالی ندی کے کھادر سے بہت بلند تھا اسلئے عوام میں یہ اونچا شہر مشہور ہوا۔ بعد میں اس کا نام بلندشہر میں تبدیل ہوا۔ برن پر راجہ ہردت قوم ڈور کا قبضہ تھا۔ راجہ ہردت نے ایک قلعہ تعمیر کرایا جو بالائے کوٹ مشہور ہے۔ وہ محمود غزنوی کے حملات کا دور تھا۔ بقول وسیم احمد سعید

> ''اسکی قدامت پانچویں صدی عیسوی کے تانبے کی منقوش لوحوں اور اس سے بھی زیادہ قدیم زمانے کے سکوں کی دریافت سے ثابت ہوتی ہے، اسے بلندشہر (یعنی اونچا شہر) اسلئے کہا جانے لگا کہ یہ کالی ندی کے کنارے جو شہر کے پاس سے بہتی ہوئی گذرتی ہے، ایک اونچی جگہ پر گذرتی ہے یہ نام صاف طور پر اسلامی ہے اور بظاہر مغلیہ دور کے کسی زمانے میں اس شہر کو اس نام

سے موسوم کیا گیا، اگر چہ سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ میں (جو ۹۶-۱۶۹۵ء کے مؤخر زمانے میں تالیف کی گئی) اس کا ذکر حسبِ سابق برن کے نام سے کیا گیا ہے۔ ۱۰۱۸ء میں اسے سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا اور یہاں کے ہندو راجہ ہردت نے اطاعت کی پیش کش کی اور اپنے دس ہزار آدمیوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوا۔ شہر ہردت کو واپس دے دیا گیا لیکن اسکے اخلاف نے اسلام ترک کر دیا اور اس خاندان کا آخری راجہ چندراسین ۱۱۹۳ء میں غوری سلطان محمد ابن اسام کے سپہ سالار قطب الدین ایبک کے خلاف شہر کی محافظت کرتا ہوا مارا گیا۔ قطب الدین نے اسے بطور جاگیر اپنے داماد اور جانشین التتمش کو عطا کر دیا۔ چندراسین کے ایک رشتہ دار جے پال نے اسلام قبول کر لیا اور شہر کو حملہ آوروں کے حوالے کر دینے کے صلے میں اسے شہر کی سرداری دے دی گئی۔ اسکے اخلاف اب تک بلند شہر میں خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں یہ شہر کسانوں کی ایک بغاوت کا مرکز رہا۔ اس بغاوت کو بادشاہ نے سختی سے فرو کرتے ہوئے اِرد گرد کا تمام علاقہ ویران کر دیا۔ اور برن کے باشندوں پر خوفناک مظالم ڈھائے۔ ۱۳۹۹ء میں باغی امیر اقبال خان (فضل اللہ بلخی)

نے یہاں پناہ لی۔ اس نے سلطان ناصرالدین محمود کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ۱۴۰۷ء میں جونپور کے سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اس شہر پر قبضہ کیا لیکن یہ سن کر کہ گجرات کا مظفر شاہ اوّل جونپور پر حملہ کرنے کو ہے اس نے بعجلت اسے خالی کر دیا۔

اسکے بعد اس شہر کا کوئی ذکر سننے میں نہیں آتا کیونکہ مغلیہ عہد میں برابر امن و امان کا دور دورہ رہا۔ سلطان اورنگزیب عالمگیر کے تبلیغی ذوق و شوق کی بدولت بہت سے لوگ اسلام کی آغوش میں آ گئے۔ جن میں سے بیشتر بلند شہر کے اندر اور اسکے گرد و نواح میں رہنے والے راجپوت تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے دوران میں، جبکہ پورے ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی، مرہٹوں نے بلند شہر کو پامال کیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ وہ اس کا نظم ونسق کوئل (علی گڑھ) سے کرتے تھے۔ علی گڑھ کے قلعہ کی تسخیر سے ۱۸۰۳ء میں بلند شہر انگریزوں کے تصرف میں آ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں یہ شہر بہت ہیجان کی حالت میں رہا۔ چنانچہ مالاگڑھ کے نواب ولیداد خان نے انگریزی محافظ فوج کو نکال دیا۔ اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ اور اسکے ساتھی گوجر اور مسلمان راجپوت

انگریزوں کے سخت دشمن ثابت ہوئے اور کہیں پانچ ماہ کی مزاحمت کے بعد جا کر انہوں نے شہر کو حوالے کیا۔

تاریخ پاک و ہند کا مطالعہ کرنے والے اس شہر سے چودھویں صدی عیسویں کے دانشور مورخ ضیاء الدین برنی کی جائے ولادت کے طور پر بخوبی واقف ہیں۔ یہاں بعض قدیم مسجدیں اور مقبرے ہیں۔جن میں درگاہ خواجہ لعل برنی بھی شامل ہے۔ جو ۱۱۹۳ء میں اسلامی فتح کی یادگار میں تعمیر کی گئی تھی۔ انگریزی عہد کے شروع میں ایک چھوٹا سا شہر ہوتے ہوئے اب یہ اندرونی و بیرونی تجارت کا ایک عظیم ترقی مرکز ہے''۔

بحوالہ: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد۴، صفحہ ۸۵۶۔

سید عبدالعزیز رئیس چھپراوت کے مطابق راجہ کے خاندان کے ایک شخص مسمّی جے پال ڈور نے اسلام قبول کیا۔ اسکو ملک محمد دراز قد کے خطاب سے نوازہ گیا۔ اور شہر کے چوہدرات کا عہدہ معہ کچھ جاگیر کے عطا کیا گیا۔ سلطان محمد غوری کا فرمان بنام ملک محمد دراز قد کے آج بھی اس خاندان میں موجود ہے۔ یہ لوگ چوہدری ٹنٹے مشہور ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ زیادہ تر جھگڑالو ہوتے تھے۔ اس لئے ٹنٹے کا لقب ان کے لئے بہت مشہور ہوا۔ بلند شہر کی حکومت کا عہدہ قاضی نورالدین غزنوال کو جو بادشاہ کے ہمراہ ولایت سے آیا تھا عطا ہوا۔ قاضی موصوف کے ورثاء

آج تک بلندشہر اور گرد و نواح میں موجود ہیں اور قاضی کہلاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ وقت گزرتا رہا۔ گرد و نواح میں دیہاتوں کی آبادیاں بڑھنے لگیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسکی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ دشمن کی فوج دیہات کی طرف کم توجہ دیتی تھی۔ وہ قصبوں پر اپنا پورا پورا تسلّط و اقتدار چاہتی تھی۔ ایک وقت وہ آیا کہ پورے ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی حکومت ہوگئی۔ جس ہندوستان کو شہنشاہ اکبر نے اپنی عقلمندی اور دوراندیشی سے مضبوط کیا، آنے والے بعد کے مغل حکمراں اسکو سنبھال کر نہیں رکھ سکے۔ انکی عیش پرستی سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر انگریزوں نے اپنا اقتدار جما لیا۔ ہندوستان میں چہار جانب افراتفری کا عالم تھا۔ نوابین، رؤسا انگریزوں سے مل چکے تھے۔ بلندشہر بھی اس سے بچ کر نہ رہ سکا۔ بہت سے رؤسا ایسے تھے جنکے آبا و اجداد نے زمانۂ غدر میں انگریزی سرکار کی خدمت کیں اور خیرخواہ رہے۔ جسکے معاوضہ میں سرکار نے ازراہِ قدر دانی خلعت و جاگیریں عطا فرمائیں۔

ایسے چند اشخاص کا تذکرہ ''تاریخ صد سالہ بلندشہر'' مولفہ سید عبدالعزیز رئیس چھپراوت کی کتاب میں ملتا ہے۔ جیسے:

۱۔ نواب محمد مکرم علی خاں صاحب، ممتاز الدولہ رئیس، پہاسو۔

۲۔ نواب محمد احمد سعید خان صاحب رئیس چھتاری، انگریزی حکومت نے ان کو عہدہ

منسٹری عطا فرمایا۔ آپ اس ضلع کے رئیسوں میں پہلے منسٹر تھے۔

۳۔ راؤ گرراج سنگھ صاحب رئیس، کُچیسر۔

۴۔ چودھری رگھوراج سنگھ صاحب رئیس، شکارپور۔

۵۔ کنور محمد تحسین علی خاں صاحب رئیس، کھیلیا۔

۶۔ سید عبدالعزیز صاحب رئیس، چھپراوت۔

۷۔ منشی محمد خاں صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ، بلندشہر۔

۸۔ چودھری رام داس صاحب رئیس، بھٹونہ۔

۹۔ چودھری امر سنگھ صاحب رائے بہادر، رئیس، پالی۔

۱۰۔ چودھری رگھوبیر سنگھ صاحب رئیس، جیور وغیرہ وغیرہ۔

۱۸۲۴ء میں بلندشہر ضلع قائم کیا گیا۔ گیارہ پرگنے ضلع میرٹھ کے اور پانچ پرگنے ضلع علی گڑھ کے شامل ہوکر بلندشہر کی کلکٹری علیحدہ مقرر کی گئی۔ ۱۸۳۵ء میں ضلع میں جیل کا قیام عمل میں آیا۔ بلندشہر ضلع قائم ہونے کے بعد سب سے بڑا حادثہ ۳۸-۱۸۳۷ء کا خوفناک قحط تھا۔ غلّہ فی روپیہ آٹھ سیر ہوگیا تھا۔ حکومتِ انگریزی نے رعایا کے لئے جمع مالگزاری نصف فرمادی۔ دیہاتوں کا بہت بُرا حال تھا۔ لوگ بھوک و پیاس سے نڈھال ہوکر دم توڑ رہے تھے۔ دور دور تک لاشیں اٹھانے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اور جو کچھ بھی باقی تھا وہ مہاجن،

ساہوکارا اور زمینداروں نے برباد کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ حالات سازگار ہوئے ۱۸۴۹ء میں نہر گنگ کا اجراء عمل میں آیا۔ ضلع میں نہر گنگ ۱۸۵۴ء سے جاری ہے لیکن آبیاشی ۱۸۵۵ء سے شروع ہوئی اسکے ساتھ تعلیم عامہ کے لئے انگریزی مدارس کی حلقہ بندی کا انتظام بھی ۱۸۴۹ء میں شروع ہو چکا تھا۔ ملک میں امن قائم ہو چکا تھا کہ ناگاہ مئی ۱۸۵۷ء میں فوج کا بلوہ بشکل قہرالٰہی نازل ہوا اور تمام ملک درہم و برہم ہو گیا۔

اس سے قبل کہ میں ۱۸۵۷ء کے غدر کا حال بیان کروں جو غدر کے بعد خاص ماجرائے عظیم ہوئے ملاحظہ فرمائیں:

اوّل، ۱۸۶۰-۶۱ء کا قحط

دوم، ۱۸۶۸-۶۹ء کا قحط

سوم، بندوبست ضلع

تاریخ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارش اس قدر کم ہوئی کہ جو بیج بویا گیا وہ سب مر گیا اور گھاس تک نہ اُگی۔ چوپائے مر گئے۔ شہروں اور مواضعات میں کھیتوں اور سڑکوں پر کثیر تعداد میں مردے پڑے ہوئے تھے جس سے تعفّن کا یہ عالم تھا کہ راستوں سے گزرنا مصیبت ہو گیا تھا۔ گھاس کی کمی سے چوپائے لاشیں کھانے لگے تھے اور انسانوں نے مردار کو بطور غذا کے استعمال کیا۔ بعض لوگ عاجز آ کر کتّوں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو تلاش کرنے لگے۔

جیسے جیسے قحط کی شدت بڑھی لوگ شہروں اور مواضعات سے ترک سکونت اختیار کر کے بچارگی کے عالم میں مارے مارے پھرنے لگے۔ انکی حالت کو سمجھنا آسان تھا۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئیں، ہونٹ پیلے اور رال سے لت پت، جسم کی کھال اکڑی ہوئی جس کے اندر سے ہڈیاں جھلکتی تھیں، پیٹ خالی، مثل ایک لٹکتے ہوئے تھیلے کے اور انگلیوں کے جوڑ اور گھٹنوں کے بند واضح طور پر نمایاں۔ کوئی اس پریشانی میں چیختا اور کوئی چلاتا اور کوئی مصیبت کا مارا دم توڑ دیتا تھا۔ جہاں بھی جایئے علاوہ لاشوں کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ عورتوں نے اپنے کو بطور باندیوں کے فروخت کیا۔ ماؤں نے اپنے بچوں کا سودا کیا۔ والدین کے چھوڑے ہوئے بچوں نے اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا۔ بعض کنبوں نے زہر کھا کر ایک ساتھ جان دے دی۔ بعضوں نے خود کو دریا کے سپرد کر دیا۔ ماؤں اور انکے بچوں نے دریا کے کنارے پہونچ کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک ساتھ اپنے کو غرق کر دیا۔ جس سے دریاؤں میں لاشیں تیرنے لگیں۔ بعضوں نے مردار کا گوشت کھایا اور بعضوں نے انسانوں کی لاشوں کو پھاڑ کر انکی انتڑیوں سے اپنا پیٹ بھرا۔ ایسا بھی پیش آیا کہ سڑک پر پڑے ہوئے انسانوں کو جو ابھی تک مرے نہ تھے، دوسروں نے کاٹ کر ان کا گوشت کھا لیا۔ ابھی سزا ختم نہیں ہوئی تھی اب خدا نے ٹڈّیوں، بڑے اور چھوٹے چوہوں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کو

مسلط کر دیا۔ جنہوں نے نو خیز فصل کو شدید نقصان پہونچایا۔ قحط پورے سال رہا اور اسکے بعد مہلک وبائیں اور بخار کی بیماری نمودار ہوئی، جسکے نتیجہ میں ایک اچھا خاصہ انسان بھی صحت مند نہ رہا۔ لاشیں راستوں میں اور مردے گھروں میں کئی کئی دن تک پڑے رہتے کیونکہ کوئی انہیں اٹھانے کی اُجرت ادا کرنے والا نہ تھا۔

۳۸-۱۸۳۷ء کا قحط، ۶۱-۱۸۶۰ء کا قحط اور ۶۹-۱۸۶۸ء کا قحط ان سب کی نوعیت زیادہ تر ایک جیسی ہی تھی حکومت مغلیہ سے لیکر انگریزی حکومت تک سبھی کو اس سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس نوعیت کے سانحات بار بار پیش آئے ہیں۔

ابتدائیہ

میں بغاوت کی ابتدا کا حال اس بیان کے ساتھ شروع کرتا ہوں کہ انگریز خود حسبِ مرضی اپنے بارے میں خواہ جو بھی رائے رکھتے ہوں، ہندوستانی انہیں ظالم سمجھتے تھے اور برطانوی سلطنت میں اودھ کے الحاق سے یہ جذبہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا تھا۔ اس واقعہ سے سب سے پہلے فوجیوں میں بے اطمینانی پھیلی جن کی اکثریت اس علاقے کے رہنے والوں کی تھی۔ پھر بغاوت سے متعلق مختلف واقعات رونما ہوئے۔ کسان خوفناک بوجھ کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ بہت سی ریاستیں تباہ و برباد ہوگئیں یا فتح کر لی گئیں۔ بہت سے خاندان اور بڑے بڑے شہر خاک میں مل گئے۔ بہت سے بے گناہ افراد کو پھانسیاں دی گئیں۔ ہمہ گیر تباہی کے بادل سارے ملک پر چھا گئے۔

یہ ایک ایسی بھیانک حقیقت تھی جو ہندوستانیوں کی صدیوں پرانی تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی، بقول مارکس

> ''اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جو مصیبت انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان پر نازل ہوئی ایسی انتہائی اور شدید قسم کی مصیبت ہندوستان نے پہلے کبھی نہ اٹھائی تھی''۔

بہت سوچنے اور سمجھنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ جس چیز کو غدر کہا جاتا ہے وہ ہندوستانیوں کے لئے غیر ملکی حکومت کے خلاف عوام کی بغاوت تھی۔ ۱۸۵۷ء ہندوستانی

عوام کے حافظے میں ایک یادگار سال ہے جس میں برطانوی حکومت کو ایک حقیقی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور اسکے اقتدار کو سخت دھکا لگا۔ بعد میں اسکی یاد نے قومی آزادی کی متعدد تحریکوں میں ایک نیا جوش پیدا کیا خاص طور پر آنے والے برسوں میں مصلّح بغاوت کی تمام کوششوں کو ۱۸۵۷ء کی روایت سے قابل قدر اخلاقی تقویت ملی۔ اغیار نے نہ صرف اس عظیم ملک کو تباہ و برباد کیا بلکہ اسکی عزت کو بھی خاک میں ملایا۔

یہ میرٹھ کے باغی سپاہیوں کی عقل سلیم کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے دریائے جمنا کو پار کیا، ہمارے قدیم ملک کی روایتی دارالسلطنت کو برطانوی غلامی کے جوئے سے آزاد کیا اور اکبر کے محروم وارث بہادر شاہ ظفر کے سر پر شہنشاہِ ہندوستان کا تاج رکھا۔ اس واقعہ کی انقلابی اہمیت کو ہر جگہ تسلیم کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرٹھ کے سپاہیوں نے فی الفور ایک قائد، ایک علم اور ایک نصب العین پا لیا تھا۔ جس سے غدر کو ایک انقلابی جنگ میں بدل دیا گیا۔

مرزا غالبؔ نے لکھا ہے کہ

> ''جوں ہی سپاہیوں کے مختلف دستے دہلی میں پہونچے، سب سے پہلے انہوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سونا چاندی شاہی خزانہ کے حوالے کر دیا پھر وہ لال قلعہ میں گئے تاکہ بادشاہ کے آستان پر سجدہ کریں۔ انکے جذبہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سودائی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئے ہوں''۔

اسی انقلابی جذبہ کو دیکھ کر رام پور کے نواب یوسف علی خاں بہادر جنہوں نے مدت سے انگریز حکمرانوں کے ساتھ پیمان دفا باندھ رکھا تھا بہادر شاہ سے وفاداری کا رسمی پیغام بھیجنے پر مجبور ہو گئے۔

دراصل میں نے اس کتاب کی ترتیب کچھ اس طور پر قائم کی ہے جو عام قارئین کے لئے قابل فہم ہونے کے علاوہ فکر کرنے والے طالب علموں کو اصل ماخذ سے متعارف کرانے کا ذریعہ بھی ثابت ہو۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی جو تصویر انگریزی طلباء کے سامنے کئی پشتوں سے پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی باشندے ان مظالم پر خوفزدہ ہو کر متحد ہو گئے تھے جو شقی القلب ہندوستانیوں نے انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں پر ڈھائے جبکہ وہ دور دراز برصغیر میں برطانوی سلطنت کا بوجھ فرض سمجھ کر اٹھائے ہوئے تھے۔

تاریخ سانکھنی کے سلسلے میں میری یہ کتاب دیر سے لکھی پڑی تھی۔ اور میں اس کو چھاپنے کا کچھ زیادہ آرزومند نہ تھا۔ جب تیار ہوا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں اس میں مزید اضافہ کرونگا۔ اور اس کی عبارتوں کے سقم کو دور کر کے اس کو پڑھنے کے قابل بناؤں گا۔ مگر میں نے دیکھا کہ سانکھنی موضوع پر یکے بعد دیگرے کتابیں شائع ہونے لگی ہیں۔ جن میں بعض میرے موضوع سے قریب ہیں۔ اس سے میرا ارادہ کمزور ہوتا گیا اور مجھے احساس ہوا کہ ان کتابوں کے ہوتے ہوئے میری اس کتاب کی اشاعت بے کار ہوگی۔ ان حالات میں اس کتاب کا مسودہ اپنی اصل حالت میں پڑا رہا اور میں اس پر نظر ثانی بھی نہ کر سکا۔ کچھ احباب کے اسرار پر ناچار کتاب پر جلدی جلدی نظر ڈالی اور مسودہ دوستوں کے حوالے کر دیا۔ جن صاحبوں نے افکار کو لیا ہے انھوں نے اصناف کا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا اور جن کے یہاں اسلوب وفن کا تجزیہ ہے وہاں افکار کی بحث نہیں۔ اس نقطہ نظر سے مجھے اطمینان ہے کہ یہ مختصر سی کتاب عام طور سے مفید ثابت ہوگی۔ خصوصاً میرے چھوٹے بہن بھائیوں اور بچوں کے لیے جن کی ضرورتوں کو پورا کرنا میری زندگی کا خاص مقصد رہا ہے۔

حالات بغاوت

مسٹر برنڈ اِسپٹ صاحب جو اُس وقت ۵۸-۱۸۵۷ء میں بلند شہر ضلع کے مجسٹریٹ و کلکٹر تھے۔انہوں نے غدر کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے کہ یہ غدر ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ پورے ملک کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا۔ میرٹھ کی فوج کے باغی ہونے پر مسٹر برنڈ اسپٹ نے ضلع کے تمام خیر خواہ رؤسا کو تحریر فرمایا کہ آپ لوگ ہماری مدد کے لئے گھوڑے اور آدمی بھیج کر انگریزی سرکار کی مدد کریں اپنی خیر خواہی ثابت کریں۔ بجواب اسکے راؤ گلاب سنگھ رئیس کچیسر نے فوراً کچھ سوار اور سپاہی مسلح بھیج دئے اور محمود علی خاں رئیس چھتاری، مراد علی خاں رئیس پہاسو، عبدالطیف خاں رئیس خانپور اور کچھمن سنگھ رئیس شکارپور نے بھی اپنی اپنی وسعت کے مطابق آدمی بھیجے۔ان کو ضلع کے ان مقامات پر تعینات کر دیا گیا۔ جہاں رعیت کی طرف سے احتمال بلوے کا زیادہ تھا۔

مسٹر ٹرنیل صاحب نے مسٹر برنڈ اسپٹ کو ابھی ابھی ضلع کا چارج دیا تھا اور وہ بلند شہر سے روانہ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ بلوہ شروع ہو گیا۔ صاحب موصوف نے اپنی کارگزاری سے مسٹر اسپٹ صاحب کو بہت مدد دی چونکہ وہ ضلع کے حالات سے بخوبی واقف تھے اسلئے یہ مدد نہایت مفید ثابت ہوئی۔ انہیں سب سے زیادہ فکر دادری اور سکندر آباد پرگنہ کی تھی کیونکہ وہ علاقہ بہ سبب کثرت آبادی گوجروں کے زیادہ مفسد تھا۔ گوجروں نے دہلی اور میرٹھ کے

حالات سنتے ہی لوٹ مار کرنا، ڈاک بنگلوں کو جلانا اور تار برقی کو توڑنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی بریلی اور نواب رامپور کے یہاں سے کوئی امداد نہیں پہونچی تھی۔ حالانکہ بریلی سے مدد کے لئے آٹھویں رسالے کے کچھ سواروں کو روانہ ہونے کا حکم ہو گیا تھا اور لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے نواب رامپور کو بھی لکھ بھیجا تھا کہ جلد از جلد کچھ سوار بھیج دیں۔

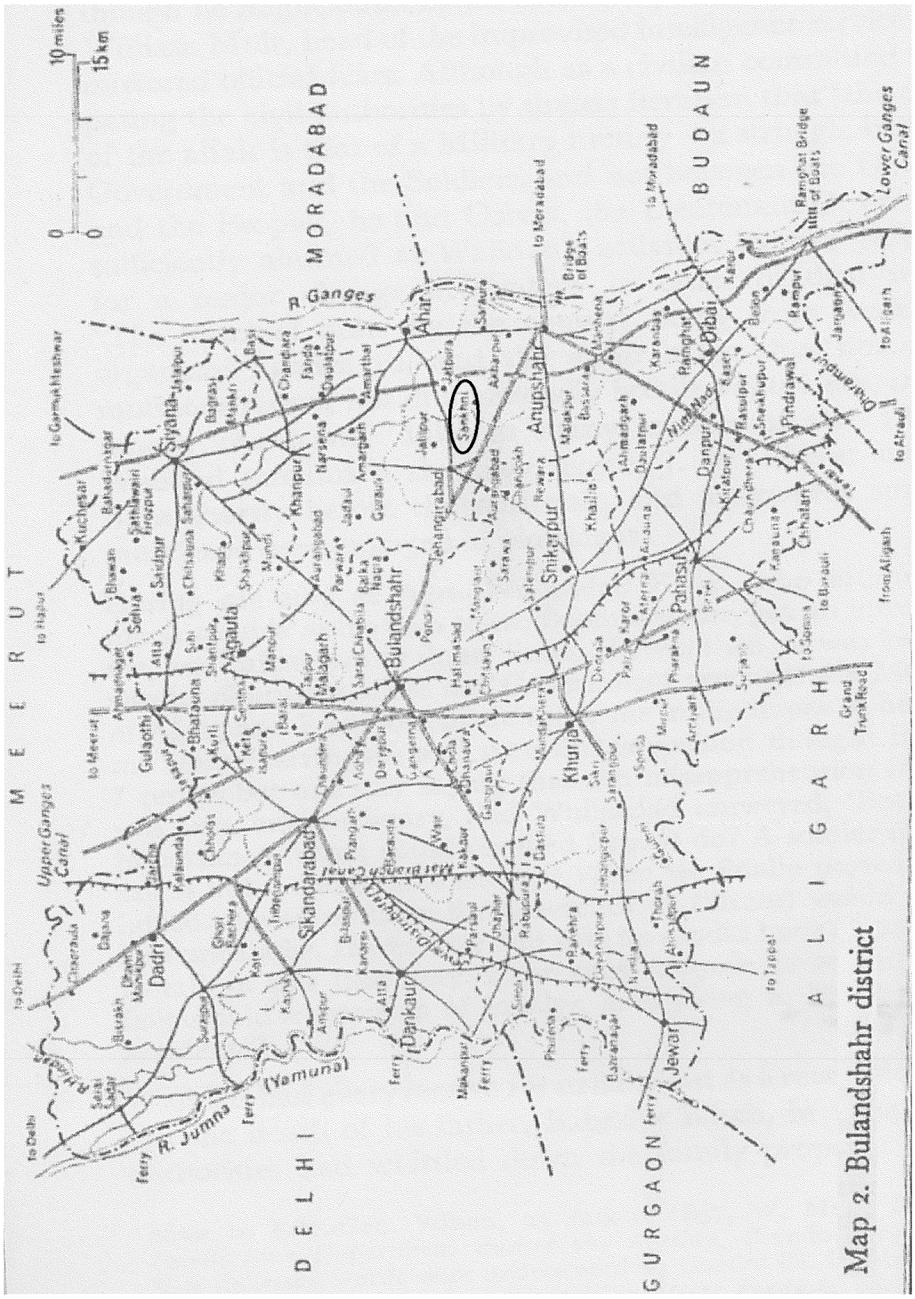
مسٹر اسپٹ صاحب نے بھی جنرل ہیوٹ صاحب کو بار بار لکھا کہ کچھ انگریزی سپاہی بلندشہر میں بھیج دیں تاکہ بلندشہر سے خزانہ میرٹھ کو ان کی حفاظت میں روانہ کرسکوں لیکن ان کی یہ درخواست منظور نہ ہوسکی۔ سرکاری خزانہ کا دو لاکھ روپیہ اور بہت سا قیمتی مال بچانے کے لئے تھوڑا سا خطرہ اٹھانا بیجا نہ تھا۔ چہار اطراف سے سپاہیوں کے باغی ہونے کی خبریں آرہی تھیں۔ سب سے زیادہ خطرہ دہلی کی جانب سے تھا کہ اگر ضلع پر حملہ ہوا تو دہلی سے ہوگا۔ لیکن خدا کے فضل سے ضلع اس سے محفوظ رہا۔ ۲۰ مئی تک روز بہ روز حالات ابتر ہوتی گئی۔

۲۱ مئی ۱۸۵۷ء صبح کو مسٹر واٹسن صاحب مجسٹریٹ وکلکٹر علی گڑھ نے یہ ضروری اور خوفناک خبر دی کہ نمک حرام نویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے علی گڑھ میں بلوہ کر دیا اور انگریزی افسر سب آگرہ چلے گئے۔ اب ڈر یہ تھا کہ اس خبر کو سُن کر بلندشہر کے سپاہی بھی باغی ہو نگے۔ اسلئے فوراً دل میں خیال آیا کہ صاحب لوگوں اور بچوں کو میرٹھ بھیج دینا چاہئے۔ اس تجویز کے مطابق ان کو ہمراہ چند افسروں کے جو میرٹھ کی طرف جانے کے لئے بلندشہر میں ٹھہرے تھے روانہ کیا۔ اور ان کی حفاظت کو کچھ سوار رسالوں کے اور کچھ جوان جدید بھرتی

کے بھیج دے گئے۔صرف بلندشہر میں پانچ افسر، ایک کلرک اور اسکا بیٹا باقی بچے تھے۔ دوپہر کو اسی روز دادری سے ایک شخص نے آکر خبر دی کہ آج شام کو پانچ بجے گوجروں کا حملہ بلندشہر پر ہوگا۔ سید عبدالعزیز رئیس چھپراوت جو شانہ بہ شانہ انگریزوں کے ساتھ تھے ان کو بہت سخت فکر ہوئی اور خزانہ سرکاری کو میرٹھ پہونچانے کی تدبیر سوچنے لگے۔ وہ فوراً ہی لیفٹیننٹ راس صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ گاڑیاں تیّار رہیں، فوراً سرکاری خزانہ میرٹھ بھیج دو۔خزانہ کی چابیاں اس وقت موجود نہ تھیں۔صندوق کا قفل توڑا گیا اور سپاہیوں سے خزانہ کی تھیلیوں کو گاڑی میں لدوانہ شروع کر دیا اور سواران رسالہ اور سواران کلکٹر کو میرٹھ چلنے کے لئے حکم دیا گیا کہ ہمارے ساتھ میرٹھ چلنے کو تیار رہوں۔ راس صاحب نے سید عبدالعزیز کو بتایا کہ سپاہی تھیلیوں کو اپنے اپنے لئے اٹھانے لگے ہیں اور یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ اپنے ہیڈ کوارٹر کے باغی ہو جانے کی خبر ان سپاہیوں کو مل گئی ہے۔ سپاہیوں کو ابھی میرٹھ چلنے کا حکم دیا بھی نہ تھا کہ گوجروں کے گروہ کے گروہ سڑکوں پر شہر کی طرف آتے ہوئے نظر پڑے۔ سپاہیوں کے ہاتھ میں خزانہ چھوڑ کر ہم نے گھوڑے ان کی طرف دوڑا دئے اور انکے عظیم گروہ کو منتشر کر دیا جو بلندشہر میں لوٹ مار کے لئے داخل ہو چکے تھے ان کو قتل اور زخمی کیا۔ شام کو ساڑھے چھ بجے میرٹھ کو روانہ ہوئے۔ رات کو ۱۰/ بجے ہاپوڑ پہونچے۔ ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو ۹ بجے صبح میرٹھ میں داخل ہو کر اپنے پہونچنے کی اطلاع جنرل صاحب حاکم کمان افسر کو دی اور کہا کہ بمشکل تمام میرٹھ پہونچے ہیں راستے میں دیہات کے لوگ ہماری تلاش میں تھے ان سے بچکر ہم کو چلنا پڑا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ گوجروں نے جس وقت بلند شہر میں قدم رکھا انگریزی بنگلوں اور کوٹھیوں کو جلانا شروع کیا اور سب سے پہلے ڈاک بنگلہ میں آگ لگائی۔ انگریزی افسروں کی چاردن کی غیر حاضری میں کل چھاؤنی برباد ہوگئی۔ مال واسباب سرکاری ہوخواہ نجی تمام کا تمام لُٹ گیا۔ کچہری کا محافظ خانہ وغیرہ سب جلا کر خاک کر دئے گئے تھے۔ اس لوٹ مار میں شہر کے لوگوں اور گرد ونواح کے دیہات کے باشندوں نے بہت دست درازی کی۔ بلند شہر سے انگریزی افسروں کا میرٹھ جانا اور علی گڑھ سے انگریزی افسروں کا آگرہ جانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ آگرہ سے میرٹھ تک کا راستہ بالکل مفسدوں کے اختیار میں رہ گیا تھا۔ صدہا مسافر مارے گئے۔ امن وامان سب جگہ سے رخصت ہوگیا تھا۔ ۲۶ رمئی کو صبح مسٹر برنڈ اسپٹ صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ علی الصباح بلند شہر پہونچے۔ راستے میں ہاپوڑ سے بلند شہر تک ۲۰ رمیل کے اندر تار برقی کے تار اور لٹھّے تمام کے تمام ٹوٹے ہوئے ملے۔ ایک کمپنی گورکھوں کی اور اسی روز دوسو سوار نواب رامپور کے بھی بلند شہر میں داخل ہوئے۔ ان کے پہونچنے پر انگریزی افسروں کی کمر مضبوط ہوگئی تھی۔ اگر ضرورت تھی تو صرف توپوں کی۔ ۲۷ رمئی کو موضع چاند پور کی تلاشی لی گئی وہاں پر بہت سا سرکاری اور خانگی اسباب دستیاب ہوا۔ اس جرم کی پاداش میں سید عبدالعزیز رئیس چھپراوت نے پورے گاؤں میں آگ لگا دی اور مقدم کو گرفتار کیا بعد میں اسکو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ سید عبدالعزیز نے میجر ریڈ صاحب سے کہا کہ مجھکو اندیشہ ہے کہ آپ کے چلے جانے سے بدخواہوں کا حوصلہ بڑھ جائیگا اور پھر نتیجہ بہت خراب ہوگا۔ میجر ریڈ صاحب روہیلکھنڈ کو جانا

چاہتے تھے۔ اگر دیہات میں بلوہ ہوا تو سواروں سے نہ رُکے گا اور کہنا بھی صحیح نکلا کیونکہ دوسرے روز سکندر آباد قصبہ جو بلندشہر سے بفاصلہ دس میل دہلی کی طرف سڑک اعظم پر واقع ہے لٹ گیا اور بہت سے باشندے مرد وعورت اور بچے لٹیروں کے ہاتھ سے بہت بے رحمی کے ساتھ قتل اور بیغیرت ہوئے۔ اس واردات میں دادری اور سکندر آباد کے اکثر دیہات کے لوگ شریک تھے۔ اہلکاران پولس نے بہت جانفشانی اور کوشش کی لیکن ابنوہ کثیر کے سامنے کیا کر سکتے تھے۔ آخر اپنی جان بچا کر چلے گئے۔ ادھر افسر بھی سخت مجبور تھے ایک آدمی بھی اس قصبہ کے آفت زدان کی مدد کے لئے نہ بھیج سکے۔ وہاں کے باشندے ہزاروں اپنا گھر چھوڑ کر بلندشہر کے گردونواح کے دیہات میں پناہ گیر ہوئے۔ اگرچہ افسروں کو سخت رنج تھا کہ رعایا ہم سے مدد کے لئے بار بار التجا کرے اور وہ مدد نہ دے سکیں۔ لیکن وہ بوجہ نواب ولیداد خاں کے جس کا قلعہ مالاگڑھ بلندشہر سے چار میل کے فاصلے پر تھا مجبور تھے۔ ولیداد خاں بادشاہ دہلی کے قریبی رشتہ داروں میں تھا اور آغاز غدر کے وقت دہلی میں موجود تھا۔ بادشاہ کی جانب سے بلندشہر اور علی گڑھ کا صوبہ مقرر ہو کر قریب ۲۶ رمئی ۱۸۵۷ء کو مالاگڑھ چلا آیا تھا۔ اس نے مسٹر برنڈ اسپٹ کے سامنے اقرار کر انگریزی سرکار کا وفادار ہونے کا وعدہ کیا تھا ساتھ ساتھ انگریزی سرکار کی خیرخواہی کا دم بھرتا تھا۔ لیکن اس پر شک تھا کیونکہ وہ اپنے ساتھ بہت سے باغی سپاہی اور نجیب لایا تھا۔ اسکے پاس توپ خانہ بھی موجود تھا۔ چاروں طرف سے رپورٹ آتی تھیں۔ کہ اس کا ارادہ دغا کرنے کا ہے۔



سانکھنی دورِ حکومت نواب ولیداد خاں' مالاگڑھ' ۱۸۵۷ء

مالاگڑھ میں ولیداد خاں کی موجودگی بلندشہر کے انگریزی افسروں کو بہت خطرناک تھی۔ ان کو یقین تھا کہ وہ جس وقت بلندشہر سے کسی طرف جائینگے ولیداد خاں فوراً ان کی واپسی بآسانی روک دیگا۔ مسٹر برنڈ اسپٹ کے مطابق اس وقت بلندشہر میں صرف سات انگریز افسر تھے انہوں نے چوکی پہرے کی گردآوری تقسیم کر لی۔ اور جب تک بلندشہر میں ٹھہرے اسی مطابق کاربند رہے۔ رات میں ہر سنتری کے پاس ایک افسر گھنٹہ گھنٹہ بعد جاتا تھا اسکا فائدہ یہ ہوا کہ اگر سپاہی بلوہ کا مشورہ بھی کریں تو یکایک بلوہ نہ ہو سکے۔ مخبروں کا چاروں طرف جال سا بچھا ہوا تھا اچانک خبر ملی کہ روہیلکھنڈ کی باغی فوج دہلی کو براہ راست انوپ شہر آتی ہے یہ سنتے ہی مسٹر برنڈ اسپٹ صاحب نے انوپ شہر کا گنگا کا پل تڑوا کر کشتیوں کو گنگا کی داہنی طرف لگوا دیا تھا۔ خدا کو نہ جانے کیا منظور تھا۔ دیہاتوں سے بھی انتظام اٹھ گیا تھا۔ قدیم زمینداروں نے موقع پا کر اپنے دیہات سے جدید قابضوں کو جبراً خارج کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن بڑے بڑے زمیندار ابھی مصلحتاً خاموش تھے۔ سوائے رئیس مالاگڑھ کے ان کو کسی تعلقدار سے خدشہ نہ تھا۔ علی گڑھ کی بھی عجیب نازک حالت تھی ایک روز انگریزوں کے ہاتھ میں آتا تھا اور دوسرے روز انقلابیوں کے قبضے میں جاتا تھا۔ عجب ہنگامہ قیامت برپا تھا۔ خورجہ کی تحصیل سے جو خزانہ بلندشہر لایا گیا اسکو بھی کچھ انقلابی لوٹ کر لے گئے۔ ۸/جون ۱۸۵۷ء کی شام کی مسٹر اسپٹ صاحب کو خبر ملی کہ بلندشہر پر دہقانوں کا حملہ ہوگا اور ولیداد خاں کے آدمی بھی اس حملہ میں شریک ہونگے۔ اس شام سید عبدالعزیز صاحب اور ٹریوٹ صاحب مالاگڑھ کی طرف روانہ ہوئے اور اس قصبہ کے قرب و جوار میں

گشت کرتے رہے۔ اگرحقیقت میں انقلابیوں نے اس روز حملہ کرنے کا مشورہ کیا ہوگا تو شاید ان کی اس تدبیر سے رُک گیا ہوگا۔ ۱۰/جون کو صبح اودھ کے انقلابیوں کی جماعت کثیر راستے میں انگریز افسروں کو بے گناہ قتل کر کے خورجہ میں داخل ہو گئی۔ انگریزی بزدل سواروں کے دل پر بہت وحشت طاری ہوئی اور وہ بھی بہت سے اسی وقت چلتے پھرتے نظر آئے۔صرف ۲۰/سوار باقی رہ گئے۔خورجہ سے جب بلندشہر لوٹے تو سنا کہ ولیداد خاں نے سرکار انگریزی کی جانب سے بلندشہر میں دخل کرلیا ہے اور سب طرح امن وامان ہے کپتان ٹریوٹ صاحب اور انکے ساتھی آگے بڑھ گئے تاکہ لوگوں کو اطلاع دیں کہ وہ پھر بلندشہر میں آگئے ہیں۔راستے میں ان کو ولیداد خاں کا اعلیٰ پروانہ اسمٰعیل خاں ملا اور اس نے خود آگے بڑھکر خیریت پوچھی۔ وہ آگے بڑھے اسمٰعیل خاں بھی انکے ہمراہ چلا اور جب شہر کے قریب پہونچے تب اس نے کہا کہ میں آگے چلتا ہوں کیونکہ شہر میں بدمعاش لوگ بہت ہیں شاید بمقابلہ پیش آجائیں۔ جب تک اسمٰعیل خاں آگے بڑھا وہ تھوڑی دور اور آگے بڑھ گئے۔ پھر اسمٰعیل خاں کی واپسی کے انتظار میں کچھ دیر کھڑے رہے۔ جب وہ دروغگو نہ آیا تب انہوں نے اس امر کی اطلاع دینے کے لئے مسٹر کلفرڈ صاحب کو بھیجا۔ کپتان ٹریوٹ بھی جلد آگئے۔ ان سے شہر کی کیفیت بیان کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ انقلابیوں کو جلد شہر سے نکالنا چاہئے۔ یہ کہکر فوراً حکم چارج کا دیا۔ جب وہ جیلخانہ کی طرف پہونچے تو دیکھا کہ بے شمار جماعت ان کے مقابلے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔انہوں نے انگریز افسروں کو سامنے آتا ہوا دیکھکر تین ضرب توپ اور بہت سی بندوقوں کی باڑھ انکی طرف چھوڑنی شروع کیں۔

جماعت کے پہلے ہی حملے میں سوار اور گھوڑے بہت بیکار ہو گئے اور نئی بھرتی کے بہادر تو پہلے ہی توپ کی آواز سُن کر پھرتے نظر آئے اور ساتھ چھوڑ گئے۔ انگریز افسر گھبرا گئے اور سیدھے گلاؤٹھی کی راہ لی۔ راہ میں مالاگڑھ پہونچ کر دیکھا کہ ولیداد خاں کی کثیر جماعت انکے مقابلے کے لئے کھڑی ہے لیکن انگریزوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بے مقابلہ کئے ہوئے بھاگے اور جب انکا تعاقب کیا گیا تو مالاگڑھ کے قریب ایک گاؤں میں گھس گئے اور گاؤں کے اندر سے بندوقیں چلانے لگے۔ لیکن خدا کا شکر کہ انگریزوں کا کوئی نقصان نہ ہوا۔

چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا۔ علی گڑھ کے حکام بھی مجبور ہو کر آگرہ چلے گئے تھے اسلئے میرٹھ سے علی گڑھ تک کا راستہ انقلابیوں کے تحت میں آ گیا تھا۔ علی گڑھ اور خورجہ میں قبضہ نواب باغی کے آدمیوں نے کر لیا اور اسکے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کو بارہ بستی کے بہت سے مسلمان دوڑے۔ آگرہ سے قاصدون کی معرفت بھی خط و کتابت ہونا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ تمام سڑک پر اور سڑک کے قرب و جوار میں انقلابیوں نے نگرانی کا انتظام ایسا کر دیا تھا کہ بغیر تلاشی لئے کوئی بھی آدمی سڑک سے نہیں گزر سکتا تھا۔ آخر کار ولیداد خاں کے پاس اتنی کمک آ گئی کہ وہ سرکار انگریزی کا بہت مضبوط اور خوفناک دشمن بن گیا۔ انگریز افسر ماہ اگست تک میرٹھ میں رہے اس دوران جھانسی کا برگڈ اور بہت سی توپوں کی کھیپ دہلی سے ولیداد خاں کے پاس آ گئی اور وہ ہاپوڑ اور گلاؤٹھی پر قبضہ کرنے کا سوچنے لگا۔ اگر میرٹھ سے انگریزوں کی فوج جلد نہ پہونچ پاتی تو جو حشر سکندرآباد کا ہوا تھا ہاپوڑ اور گلاؤٹھی کا بھی ہوتا۔ ہاپوڑ میں انگریزی فوج ۲۰ ر ستمبر ۱۸۵۷ء تک مقیم رہی یعنی جب تک دہلی فتح ہوئی۔

اسی اثنا میں ایک روز انگریزوں کو تھوڑی دور پر توپوں کی آواز سنائی دی وہ لوگ متعجب ہوئے بعد میں معلوم ہوا کہ جھانسی کی برگڈ نے بھٹونہ پر حملہ کر دیا ہے۔ اس گاؤں کے باشندوں نے چند روز پیشتر ولیداد خان کے آدمیوں سے تین ضرب توپ چھین لی تھیں۔ دوسرے روز علی الصباح انگریزی افسر بھٹونہ کی طرف گئے۔ دریافت ہوا کہ بہادر جاٹوں نے اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کو شکست دیکر مالاگڑھ کی طرف بھگا دیا تھا۔

۲۸ رستمبر ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کا بلندشہر پر قبضہ ہو گیا تھا اور انقلابی میدان چھوڑ کر اِدھراُدھر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انگریز افسروں کے ہاتھ بہت سا مال و اسباب توپیں وغیرہ انقلابیوں سے ہاتھ لگیں۔ اسکے بعد آہستہ آہستہ میرٹھ سے علی گڑھ تک کا راستہ انقلابیوں سے صاف کر دیا گیا۔ ایک روز معلوم ہوا کہ اس لڑائی کے اثناء میں مالاگڑھ کا نواب ولیداد خاں اپنے قلعہ سے معہ بہت سے ہمراہیوں کے جہانگیرآباد، سانکھنی اور مہرسہ ہوتا ہوا گنگا پار بھاگ گیا ہے اسکے نکل جانے میں جہانگیرآباد کے نواب مصطفٰے خان شیفتہ نے بہت مدد کی۔ کیونکہ نواب صاحب کی قریبی رشتہ داری ولیداد خاں سے تھی اور ولیداد کی قریبی رشتہ داری شہنشاہِ ہندوستان بہادر شاہ ظفر سے تھی۔ ۱۸۵۲ء میں ولیداد خاں کی بھتیجی کی شادی پرنس مرزا جواں بخت سے ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے نواب ولیداد خاں کا نام شاہی گھرانے سے جڑ گیا تھا۔ اسی وجہ سے نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی خط وکتابت دہلی سے برابر ہوتی رہتی تھی۔ یہ بات انگریزوں کو بخوبی معلوم تھی۔ انگریزوں نے فی الحال اسکو بالائے طاق رکھ کر ضلع کے بندوبست کو سنبھالا۔ مال گزاری کی وجہ سے بہت سی

دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سرکاری خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ عبداللطیف خان جو ڈیڑھ سو گاؤں کا تعلقہ دار تھا، اس نے بھی ولیداد خاں کے بھاگ جانے پر مال گزاری داخل کر دی۔ حالانکہ اس سے کئی بار کہا گیا تھا۔ بار بار تقاضہ ہونے پر بھی مال گزاری داخل کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ یہ شخص بارہ بستیوں کا سردار تھا۔ عدالت ملٹری کمیشن سے اسکے اوپر جرم انقلابیوں کو ہر طرح مدد دینے کا ثابت ہوا۔ اسکو سزا سنائی گئی۔ اسکے چچا اعظم خان نے ولیداد خاں کی شراکت میں انگریزوں کے ساتھ بہت عداوت کی تھی۔ جب وہ گنگا پار بھاگ جانے کے ارادہ سے انوپ شہر پہونچا خوشی رام تھانیدار انوپ شہر کے ہاتھ گرفتار ہوا اور تحقیقات کے بعد اسکو پھانسی دی گئی۔ اعظم خاں نے خوشی رام سے کہا تھا کہ جتنا چاہئے روپیہ لے لو اور مجھکو نکل جانے دو لیکن بھٹونہ کے دیانت دار جاٹ نے ایک نہ سنی اور گرفتار کر کے عدالت پہونچا دیا۔

اسکے بعد شہر اور چھاؤنی کا انتظام کر کے سید عبدالعزیز صاحب اور کرنل فارکر ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو گنگا کی طرف دورہ کو نکلے تا کہ گھاٹوں پر کشتیوں کی حفاظت کا بندوبست کریں لیکن اہار کے مقام پر جو بلند شہر سے تقریباً ۲۵ میل ہے پہونچتے ہی خبر ملی کہ گوجروں کا ارادہ جیل خانہ پر حملہ کر کے اپنے ہم قوم قیدیوں کو چھڑا لے جانے کا ہے۔ سید عبدالعزیز صاحب نے کرنل فارکر صاحب سے کہا کہ ہم کو ایک کوچ میں بلند شہر پہونچنا چاہئے۔ وہ سانکھنی جہانگیر آباد ہوتے ہوئے کچھ انقلابیوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے (ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو چہار دیواری، حظیرے قبرستان، سانکھنی میں قبریں بنی ہوئی ہیں وہ انہیں

مسلم انقلابیوں کی ہیں جو ولیداد خاں کے ساتھ تھے۔ کسی بھی خاندان کا کوئی بزرگ فرد یہ بتانے کو تیار نہیں کہ یہ کس کی قبریں ہیں۔ یہ ہی ہمیشہ سننے میں آیا کہ یہ انگریزوں کے زمانے کی قبریں ہیں۔ میرا اپنا ذاتی خیال بھی اسی جگہ آکر ٹھہرتا ہے کہ یہ انقلابی حضرات کی قبریں ہیں۔ جیسا دیکھنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے)۔ دوسرے روز صبح کے وقت بلندشہر میں داخل ہوئے اگر اس روز نہ پہونچے ہوتے تو کچھ شک نہیں کہ جیلخانہ پر گوجروں کا حملہ ہو گیا ہوتا۔ ضلع میں فارکر صاحب ایک ماہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹھہرے لیکن انکو سب سے زیادہ ندیوں کے گھاٹوں کی فکر تھی۔ کبھی رام گھاٹ، کبھی انوپ شہر اور کبھی اہار دورے کو نکلتے اور کئی کئی روز وہاں قیام کرتے کیونکہ سب سے زیادہ انقلابی انہیں گھاٹوں پر کشتیوں کے ذریعہ آتے تھے۔ گھاٹوں کی تمام کشتیوں کو انوپ شہر کے نیچے جمع کر دیا گیا تھا۔ انکی حفاظت کے واسطے دوسو جاٹ تعینات کر دئے گئے تھے۔ جاٹوں نے انگریزوں کے ساتھ بہت وفاداری کا ثبوت دیا۔ انوپ شہر، اہار اور گڑھ کے گھاٹ راؤ گر راج سنگھ، رئیس کچیسر کے سپرد کئے گئے، اسکے بعد شکارپور، ڈبائی ہوتے ہوئے رام گھاٹ پہونچے۔ قصبہ کے قریب پہونچ کر توپوں کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ موضع گنّور پر انقلابی حملہ کر رہے ہیں۔ یہ گاؤں رام گھاٹ سے چند میل کے فاصلے پر ضلع بدایوں میں ہے اس کے باشندے سرکاری خیرخواہ ہیں۔ انقلابیوں نے گنّور کو خوب لوٹا اور قتل و غارت کیا اسکے بعد ہر طرف دست درازی کی۔ اہیروں نے جن کی جماعت کثیر تھی اوّل کچھ مقابلہ انقلابیوں کا کیا لیکن اپنی مدد پر کسی کو نہ پایا تو ان سے معاملہ کر لیا اور انکے شریک ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انقلاب اب قصبوں تک محدود نہیں رہ گیا تھا۔ گاؤں بہ گاؤں قریہ بہ قریہ انقلاب کے شعلے بھڑک رہے تھے پورا ہندوستان آگ کے شعلوں میں جل رہا تھا۔ انگریزوں کو انگریزی سپاہیوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اب ان کا ایک ہی نظریہ باقی رہ گیا تھا کہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو''۔ ایک نہ ایک روز کہیں دوسری جگہ کے گشت پر نکلتے تھے۔ گنّور کی قتل و غارت کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسرے روز کرنل فارکر صاحب نے اترولی چلنا قرار پایا لیکن یہ بات سُن کر کہ حرمت خاں ساکن پنڈراول اپنے قلعہ میں فوج انقلابی کے واسطے سامان جمع کرتا ہے فوراً ہی پنڈراول کی جانب کوچ کیا۔ اور مغالطہ کے طور پر خیمہ اترولی کی جانب روانہ کر دیا۔ یکا یک پہونچنے سے حرمت خان کچھ بندوبست نہ کر پایا۔ انگریزی افسروں نے بہت سا سامان رسد کا مہیّا پایا اور بیشک یہ سامان فوج انقلابی کے لئے جمع کیا گیا تھا۔ علاوہ اسکے حرمت خان اپنے قلعہ کی مرمّت میں مصروف تھا۔ اس سے پیشتر افسروں نے حرمت خان سے دو ضرب توپ جمع کرالیں اسکے ملازموں سے ہتھیار لئے اور قلعہ کو مسمار کر دیا۔ حرمت خان کے خلاف انقلابیوں اور باغی سپاہیوں کو اکٹھا کرنے، نواب ولیداد خاں سے خط و کتابت رکھنے اور اسکی مدد کرنے پر مقدمہ لگا دیا گیا۔ اسکے بعد اترولی گئے۔ کرنل سیٹن صاحب کے احکام کی بجا آوری کر کے بلندشہر کی طرف واپس ہوئے۔ راستہ میں پنڈراول کو پھر ملاحظہ کیا۔ ۱۵ر روز ضلع سے باہر رہ کر ۲۹ر دسمبر کو بلندشہر میں داخل ہوئے۔ اس دوران شہر میں امن و امان رہا۔ ۲ر جنوری ۱۸۵۸ء کو خوشی رام نے اطلاع دی کہ انقلابیوں کی جماعت کثیر اس پار مقام چاؤ پور انوپ شہر کے سامنے جمع ہوئی ہے اور

انوپ شہر میں حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ضلع سے مسٹر لائیل کو چند سواروں کے ساتھ انوپ شہر بھیجا گیا وہ ایسے وقت میں وہاں پہونچے کہ انقلابیوں کا حملہ ہو چکا تھا۔خوشی رام اور بہادر جاٹون نے ان کو بہت نقصان پہنچایا اور ایک انقلابی کو بھی پار نہیں اترنے دیا۔دو ضرب توپوں سے جواب دیا گیا۔انقلابی فوج کا بہت نقصان ہوا اور واپس لوٹ گئے۔گھاٹ پر چند کشتیوں کو ضرور نقصان ہوا لیکن کسی بھی آدمی کو کسی طرح کا صدمہ نہ پہنچا۔کیونکہ انقلابیوں کا نشانہ اونچا لگتا تھا۔اس خبر کو سن کر کرنل فارکر صاحب نے فوراً ہی انوپ شہر کی طرف رُخ کیا۔اس وجہ سے کہ انقلابیوں کی روک ٹوک رکھنا ضروری تھا۔۱۷رجنوری ۱۸۵۸ءکو انقلابی پھر انوپ شہر کی طرف آئے اور اس مرتبہ ان کا زور شور بہ نسبت سابق کے بہت زیادہ تھا۔چھ ضرب توپیں بھی انکے ہمراہ تھیں انوپ شہر میں اس وقت لیفٹیننٹ اسمِتھ صاحب کا قیام تھا انہوں نے اپنے تجربہ اور سوچ سے انقلابیوں کی توپوں کا چلنا بند کر دیا۔کرنل فارکر صاحب کی موجودگی میں مقابلہ ہوا۔انقلابی سپاہیوں کے قریب ۵۰ آدمی ہلاک ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔اگر کرنل فارکر صاحب کو گنگا پار کرنے کی ممانعت نہیں ہوتی تو سب انقلابیوں کو قتل کرا دیتے۔اسکے بعد پھر کسی انقلابی نے انوپ شہر میں آنے کا قصد نہ کیا۔

ضلع میں سب سے زیادہ نقصان پرگنہ سکندرآباد کا گوجروں اور موضع جارچہ کے سیّدوں کے ذریعہ ہوا۔گھروں کو لوٹا گیا، آدمیوں کو قتل کیا گیا اور مستورات کی بے عزّتی کی گئی۔انگریزوں کو اس پر بہت صدمہ ہوا۔سپاہیوں اور رسد کی کمی ہونے کے باعث وہ قلعہ سے باہر جانے میں بہت معزور تھے۔اسلئے جلد کوئی کاروائی بھی عمل میں نہیں لائی جا سکتی تھی۔

دہلی کی فتح کے بعد جب حکام انگریزی ضلع بلند شہر واپس آئے تو نواب ولیداد خاں کے سپاہیوں نے بہت سخت مقابلہ کیا لیکن ان کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ خود ولیداد خاں جہانگیر آباد، سانکھنی، اہار کے راستے اس مقابلے میں گنگا پار بھاگ گیا تھا اور بعد میں سننے میں آیا کہ وہ نیپال نکل گیا تھا۔ ولیداد خاں رئیس مالاگڑھ تمام انقلابیوں کا سرغنہ تھا۔ بادشاہِ دہلی سے نواب ولیداد خاں کی رشتہ داری تھی اوّل مرتبہ جب ضلع سے انگریز حکام چلے گئے تو یہ شخص انقلابی ہو گیا اور بادشاہ سے عہدہ صوبہ داری بلند شہر اور علی گڑھ کا حاصل کر کے اس نے انگریزی عمل داری کو سراسر پلٹ دیا۔ بلند شہر اور دیگر قصبات کے بہت سے سرکاری بدخواہوں نے اسکی نوکری قبول کر کے اپنے غریب ہمسایوں پر سخت ظلم کئے۔ ولیداد خاں کے جانے کے بعد اسکے قلعہ کو مسمار کر دیا گیا اور تمام مال و ملکیت سرکار نے ضبط کر لئے۔



منہدم قلعہ نواب ولیداد خاں، مالاگڑھ، ضلع بلند شہر

''بلند شہر سے چار میل دور مالاگڑھ کا قلعہ ہے۔ ولیداد خاں وہیں کے تعلقہ دار تھے۔ رشتہ میں بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔ غدر کا آغاز ہوا تو یہ دہلی میں موجود تھے۔ ۲۶ رمئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ سے دوآبہ کی سند لیکر لوٹے۔ یہاں انہوں نے بادشاہ دہلی کا صوبے دار ہونے کا اعلان کر کے حکومت کا نظام سنبھالا۔ گلاؤٹھی پر قبضہ کر کے آگرہ اور میرٹھ کے درمیان ایک جنگ میں شکست ہوئی جسکی اطلاع انہوں نے بہادر شاہ کو دیکر مدد کی درخواست کی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ گلاب سنگھ، رام چندر اور دھنپت رائے کو ولیداد خاں کی معاونت کی غرض سے بھیجا جائے۔ ۲۰ر جون کو انگریزوں نے دو ہزار انگریزی فوج کے ساتھ یورش کی تو ولیداد خاں نے بہادر شاہ سے پھر امداد طلب کی۔ چونکہ دہلی میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اسلئے ان کی اس درخواست کو مسترد کر دیا گیا۔ دہلی پر تسلط کے بعد انگریزی فوجیوں نے بلند شہر پر زبردست حملے کئے چونکہ قلعہ مالاگڑھ میں خود انگریزوں کا جاسوس موہن لال بیٹھا ہوا تھا اسلئے اسی نے قلعہ کی مکمل کیفیت میرٹھ بھیج کر انگریزوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ جسکی وجہ سے انہیں قلعہ فتح کرنے میں بڑی مدد ملی۔ مالاگڑھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد ولیداد خاں نے بریلی کا رُخ کیا اور وہاں انہوں نے خان بہادر کی معاونت سے دشمن سے جنگ جاری رکھی اسکے بعد وہ

اودھ کے باغیوں کے ہمراہ نیپال چلے گئے۔ یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے انکے قلعہ کو سرنگوں سے اڑا کر مسمار کر دیا۔''

(بحوالہ سرگذشت دہلی، مصنف خواجہ حسن نظامی)

مختصر لیکن اہم:

☆ غلام حیدر خان زمیندار چند مواضعات پرگنہ برن کا تھا۔ ولیداد خاں سے اسکی دوستی تھی۔ بغاوت میں اسکے ساتھ برابر شریک رہا۔ اس نے زمینداروں کو سخت اذیت پہونچائی اور بے غیرت کیا۔ شکست مالاگڑھ کے بعد میرٹھ بھاگ گیا۔

☆ عبدالطیف خاں رئیس خانپور یہ شخص ڈیڑھ سو گاؤں کا مالک ضلع بلند شہر اور میرٹھ کی بارہ بستی کے پٹھانوں کا سردار تھا اس نے بھی ولیداد خاں کی مدد کی۔ بادشاہ دہلی سے خط و کتابت رکھی۔ آخر کار جرم ثابت ہوا۔ کل جائداد ضبط کر لی گئی اور اسکو سزا دیکر انڈمان نیکوبار (کالا پانی) بھیج دیا گیا۔ اسی کے ساتھ شکارپور کے سادات معافیدار رحم علی خاں کی رفاقت کر کے اپنی معافی کا حق کھو بیٹھے اور بہت سے پٹھان عبدالطیف خاں کا ساتھ دیکر برباد ہوئے۔ معافی کے اشتہار نے انکو سزا سے بچا لیا۔

☆ نواب مصطفٰے خان، رئیس جہانگیر آباد رشتہ دار ولیداد خاں کے تھے اپنے مخالفین پر غالب رہنے کے لئے انہوں نے ولیداد خاں سے مدد لی۔ تحقیقات ہونے پر ثابت ہوا کہ

نواب مصطفےٰ خاں نے سرکار انگریزی کی بدخواہی میں بادشاہ دہلی کے ساتھ خط و کتابت کی چنانچہ اس جرم میں انکو سات سال کی سزا سنائی گئی۔ لیکن گورنمنٹ نے قصور معاف کر کے سزا منسوخ کر دی۔

''نواب مصطفےٰ خان جہانگیر آباد کے تعلقہ دار تھے۔ شعر و سخن کا ذوق تھا۔ اردو میں شیفتہؔ اور فارسی میں حسرتیؔ تخلص رکھتے تھے یہ نواب ولیداد خاں (جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا) کے عزیزوں میں تھے یہ خود بھی انقلابی خیالات رکھتے تھے۔ جن کا عکس ان کے خطوط میں نظر آتا ہے جو انہوں نے بہادر شاہ ظفر کو لکھے تھے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد انہیں سات سال قید کی سزا سنائی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔ اور دو تین ماہ کی سزا کاٹ کر رہا ہو گئے۔ ۱۸۶۹ء میں انکی وفات ہوگئی۔ نواب شفتہؔ اور نواب اسحاق خاں اور ان کا خاندان حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں دفن ہیں۔ درگاہ کی بڑی مسجد کے گوشہ شمال اور سماع خانہ کے غرب میں یہ قبرستان واقع ہے۔ کتبے لگے ہوئے ہیں۔''

بحوالہ سرگذشت دہلی، مصنف خواجہ حسن نظامی

آخر ناکامی کیوں؟

حقیقت میں یہ ایک ایسی بھیانک حقیقت تھی جو ہندوستان کی صدیوں پرانی تاریخ میں کبھی دیکھنے کو نہیں آئی۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جو مصیبت انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان پر نازل ہوئی ایسی انتہائی اور شدید قسم کی مصیبت ہندوستان نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی تھی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے اسباب نے برطانوی اور ہندوستانی مورخین کو بہت پریشان کیا ہے۔ برطانوی مورخین نے اس حقیقت پر زور دیا کہ بغاوت اس لئے ناکام ہوئی کہ انقلابی نہ تو اچھی طرح منظّم تھے اور نہ ہی متحد۔ وہ کام کے لئے فوجی رہنما پیدا نہ کر سکے۔ ہندوستانی مورخین کا یہ خیال ہے کہ انقلابی رہنماؤں میں کوئی بھی حبّ الوطنی کے خالص جذبہ سے متاثر نہ تھا بلکہ خودغرضی غالب تھی۔

سچ کو لاکھ پردوں میں چھپایا جائے وہ ایک نہ ایک دن سامنے ضرور آتا ہے سچ بھی یہی ہے کہ ہندوستانی انقلابیوں میں حبّ الوطنی کی بہت زیادہ کمی محسوس کی گئی ان کو آگے بڑھانے کے لئے کوئی اچھا رہنما نہیں تھا ان کی خودغرضی ان کو متحد نہ رکھ سکی۔ تعلیم کی کمی اور اچھے رہنماؤں کی وجہ سے ہندوستانی عوام کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔

دہلی کے محاصرے کے دوران انگریز ایجنٹوں نے بار بار کوشش کی کہ ہندو مسلم متحدہ جہاد کو ہندو مسلم خانہ جنگی میں بدل دیں تا کہ بھائی، بھائی کی جان لے۔ ۱۸۵۷ء کے ماہ مئی میں انگریز ایجنٹوں نے جہاد کے نام پر ہندوؤں کے خلاف، مسلمانوں کے خلاف کان بھرنے شروع کر دئے اور اس معاملے کو بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ جہاد انگریزوں کے خلاف ہے۔ میں نے ہندوؤں کے خلاف اسکی سخت ممانعت کر دی ہے۔ اس طرح ہمارے انقلابی آبا و اجداد نے غیر ملکی غلبہ کے خلاف ایک متحدہ انقلابی جد و جہد کو منظّم کرنے اور جاری رکھنے کے لئے مذہب سے کام لیا۔ انقلاب کے تاریخی حالات میں اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جد و جہد کی نظریاتی صورت مذہبی رنگ اختیار کرے۔ کسی اور چیز کی توقع رکھنا مصلحت کے منافی اور غیر معقول ہوتا۔

دہلی کے بارے میں بھی بہت سی جھوٹی خبریں اڑائی گئیں۔ مثلاً یہ کہ انگریز خواتین کو سڑکوں پر برہنہ حالت میں چلنے پر مجبور کیا گیا۔ کھلّم کھلاّ بے حرمتی کی گئی۔ کم سِن لڑکیوں کو بھی نہیں بخشا گیا وغیرہ وغیرہ۔

''سر ولیم میور اپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں کہ خواہ کتنی بھی ستم رانی اور خونریزی ہوئی ہو جہاں تک میرے مشاہدات اور تحقیقات کا تعلق ہے عورتوں کی بے حرمتی کی کہانیوں کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملا''۔ انگریزوں کے ہاتھوں دہلی

کی غارت گری کے بارے میں لارڈ ایلفنسٹن نے سر جان لارنس کو یوں لکھا

''دہلی کا محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری فوج نے جو ظلم وستم ڈھایا وہ حد درجہ جگر خراش ہے۔ دوست اور دشمن کی تمیز کئے بغیر ہمہ گیر انتقام لیا جا رہا ہے۔ جہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے ہم نے یقیناً نادر شاہ کو بھی مات کر دیا ہے''۔

قیصر التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ ''دہلی میں پھانسی پانے والوں کی تعداد ستائیس ہزار تھی''۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک تاریخی واقعہ ہے جو پورے تاریخی دور کے اختتام اور نئے عہد کے آغاز کی علامت تھا، بغاوت ناکام ہوئی لیکن ہندوستان کو وہ تجربہ حاصل ہوا جس سے وہ نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر جدید ہندوستانی قومی تحریک تعمیر کرنے کے قابل ہو گئے۔ فریقین نے ۱۸۵۷ء کے تجربہ سے سبق حاصل کئے اور بعد میں ان سے استفادہ کیا۔ کہنا پڑے گا کہ انگریز فاتح تھے۔ انہوں نے جلد اقدامات کئے۔ ہم مفتوح تھے ہم نے زیادہ وقت لیا۔

انجمن حیدری (رجسٹرڈ) سانکھنی

انجمن حیدری سانکھنی کا قیام ۱۹/ویں صدی عیسوی میں عمل میں آیا۔ جس کا اصل مقصد قوم میں اتحاد و اتفاق، اخوّت و بھائی چارہ اور مساوات قائم کرنا تھا کیونکہ ۱۸۵۷ء میں انقلاب آزادی کے دوران مسلم قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ سانکھنی میں ایسی کوئی تنظیم نہیں تھی جو اس قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی کام کر سکے۔''مرزا ماتم حسین پردھان اپنے روزنامچے میں تحریر کرتے ہیں کہ انجمن کا اصل مقصد اہل سانکھنی کو علم کی طرف متوجہ کرنا تھا تاکہ سانکھنی میں اتّحاد و مساوات و امن قائم رہ سکے''۔ انجمن حیدری نے سانکھنی میں سب سے پہلے ۱۸۶۹ء میں حیدری پرائمری مدرسہ کی بنیاد رکھی جو بعد میں انگریزی حکومت سے ایڈیڈ (Aided) ہوکر اسکول بنا۔ ۱۹۶۲ء میں انجمن حیدری کا رجسٹریشن عمل میں آیا۔ جس کا صدر دفتر پہلے ہی سے سانکھنی میں موجود تھا، آزادی سے قبل و آزادی کے بعد سانکھنی کے افراد کا تعلق اپنے ذریعہ معاش کی خاطر دہلی سے بہت زیادہ وابستہ رہا۔ اسی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ۱۹۶۲ء کشن گنج دہلی میں انجمن حیدری (رجسٹرڈ) سانکھنی کے برانچ آفس کا قیام عمل میں آیا۔ رجسٹریشن کے بعد سب سے پہلے صدر الحاج منشی مرزا محمد حسنین صاحب بنائے گئے۔ ۱۹۶۲ء دہلی ہی میں انجمن حیدری رجسٹرڈ کے رجسٹریشن کا سلور جوبلی پروگرام منعقد کیا گیا۔ جس میں ہندوستان کی مشہور و معروف انجمنوں کے عہدیداران نے شرکت کی۔ شروع تا آخر جو کارہائے نمایاں انجمن حیدری نے انجام دئے ان کا گوشوارہ بھی پیش کیا گیا۔

جب حیدری پرائمری اسکول، حیدری جونیئر ہائی اسکول بنا تو اس کی بلڈنگ کے سنگِ بنیاد میں مرزا غلام حسین مرحوم نے بہت عرق ریزی و جاں فشانی سے کام کیا اور بغیر کسی اُجرت کے بلڈنگ کے مکمّل ہونے تک دن رات اسکول سے جڑے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں حیدری جونیئر ہائی اسکول حیدری ہائی اسکول ہوا۔ اس وقت انجمن حیدری (رجسٹرڈ) سانکھنی کے صدر اور حیدری ہائی اسکول کے مینیجر ماسٹر مرزا یوسف علی صاحب تھے جو کہ دہلی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ اپنے عہدے پر اپنے فرائض کو نباہتے ہوئے ماسٹر مرزا یوسف علی صاحب نے انجمن و اسکول کے کام کو بھی بحسن وخوبی انجام دیا اور اسکول سے متعلق اپنے نیک مشوروں کے ساتھ اپنے کام کو عملی جامہ پہنایا وہ خود بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے پوسٹ گریجویٹ تھے اس لئے ان کو قوم کی ترقی کا پاس تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حیدری ہائی اسکول آج ہمارے سامنے حیدری انٹر کالج کی شکل میں موجود ہے جس میں بستی کے علاوہ گرد و نواح کے طلّاب کسبِ علم کر رہے ہیں۔ بہت سے طلّاب اس درس گاہ سے فیضیاب ہو کر بیرونی ممالک اور اندرونِ ملک میں ملازمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں خاکسار بھی اسی درسگاہ کا ایک طالب علم رہا ہے جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سیکشن آفیسر (ایڈمنسٹریشن) کے عہدے پر رہ کر اپنی نجی ذمہ داریوں کو سرانجام دے رہا ہے۔ ایک عرصۂ دراز سے جو سانکھنی میں مساجد، عید گاہ، دینی درسگاہیں اور امام بارگاہ وغیرہ کی بوسیدہ حالت تھی ان سب کو انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی نے از سرِ نو نئے طریقے سے منظّم کیا۔ مغل مسجد، مسجد عظیم بیگ اور درگاہِ بیت المراد حسینیہ کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔ جو مغلیہ سلطنت کی طرز تعمیر کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔ جو آج اپنا سینہ تانے ہوئے بستی کے

ساتھ ساتھ اپنے ضلع کی رونق کو دوبالا کئے ہوئے ہیں۔ جب بستی کے ذمّہ دار افراد نے یہ محسوس کیا کہ اب وطن کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کی ضرورت ہے تو ان کے ذہن میں برجستہ مولائے کائنات حضرت علیؑ کے قول پر نظر گئی جس قول میں مولائے کائنات نے فرمایا کہ ''اپنے بچّوں کی تربیت اپنے زمانے کے طور طریقوں کے مطابق نہیں بلکہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق انجام دو کیونکہ وہ تم سے مختلف زمانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں''۔ اسی قول کی پیروی کرتے ہوئے انجمن ھٰذا نے ایک حیدری پبلک اسکول (انگلش میڈیم) تعمیر کرایا۔ جس میں انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی جدید تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا تاکہ نئی نسل کے طلّاب زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ سکیں۔

اس حیدری پبلک اسکول کی بنیاد میں کلیدی و مرکزی کردار مرزا فردوس علی و ماسٹر مرزا نواب علی کا پیش پیش رہا۔ سانکھنی کی تاریخ میں جہاں حیدری پبلک اسکول کا ذکر ہوگا وہاں اگر مرزا توقیر علی (حال مقیم امریکہ) کا تذکرہ نہ ہو تو یہ ناانصافی ہوگی۔ جنہوں نے اپنی بے بہا محنت اور لگن سے اپنے آبائی وطن سانکھنی کے اس قومی ادارے کی خدمت اور مالی امداد فراہم کرنے کو اپنا نصب العین سمجھا۔ مرزا توقیر علی صاحب کو اسکول کی جانب متوجہ کرنے میں مرزا محمد ثقلین کا اہم کردار رہا ہے جو اس وقت ادارے کے جنرل صدر کے عہدے پر فائز تھے۔



مغل جامع مسجد سانکھنی، زیر تولیت انجمن حیدری (رجسٹرڈ)



بیرونی دروازہ مغل جامع مسجد سانکھنی، زیر تولیت انجمن حیدری (رجسٹرڈ)



امام بارگاہ بیت المراد حسینیہ، سانکھنی، زیر تولیت انجمن حیدری (رجسٹرڈ)

انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی/ وابستگانِ انجمن کی تعمیرات وادارے

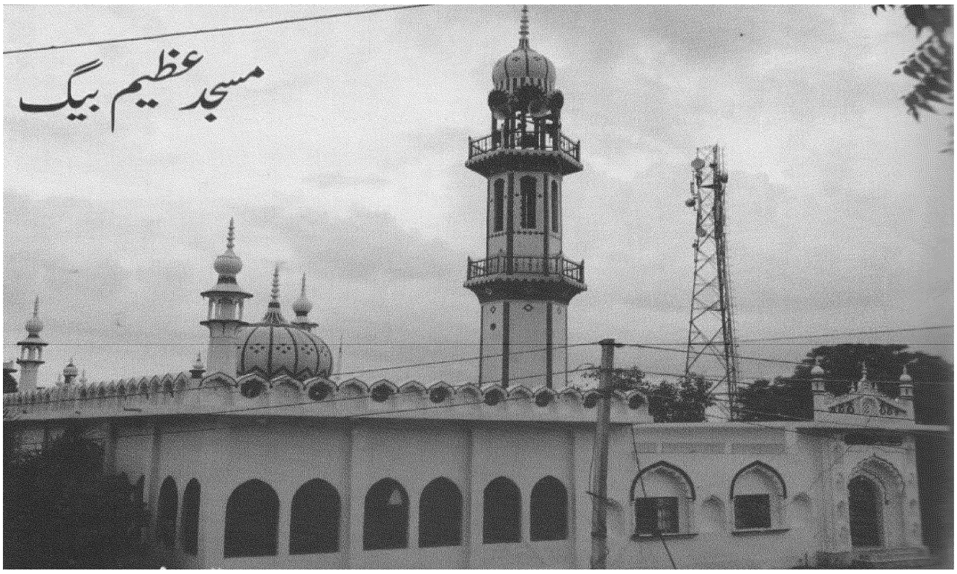
۱۔ پرائمری اسلامیہ امدادی مکتب
۲۔ حیدری جونیئر ہائی اسکول
۳۔ حیدری ہائر سکنڈری اسکول
۴۔ حیدری انٹر کالج
۵۔ حیدری پبلک اسکول
۶۔ حیدری گرلس اسکول
۷۔ حیدری لائبریری
۸۔ درگاہ بیت المراد حسینیہ
۹۔ درگاہ بیت الصابرہ
۱۰۔ درگاہ بیت الیتیمہ
۱۱۔ مغل شیعہ جامع مسجد سانکھنی
۱۲۔ مسجد عظیم بیگ
۱۳۔ مسجد قاضی والی
۱۴۔ مسجد امامیہ بڑی ماتا والی
۱۵۔ مسجد ابو طالبؑ
۱۶۔ حیدری ہال و برانچ آفس برہمپوری، دہلی
۱۷۔ مدرسہ اسلامیہ حیدری ہال، دہلی
۱۸۔ ہیڈ آفس انجمن حیدری
۱۹۔ رہائش گاہ پیش نماز
۲۰۔ عیدگاہ قدیمی
۲۱۔ انجمن حیدری اسٹور
۲۲۔ مسجد تکیہ والی (اب سنّی وقف بورڈ کے ماتحت)
۲۳۔ تنظیم الاصلاح کمیٹی
۲۴۔ مکتب امامیہ نور الزہرا
۲۵۔ جامعہ البتول
۲۶۔ ادارہ لوح وقلم
۲۷۔ مکتب امامیہ اکبریہ، مصطفےٰ آباد، دہلی
۲۸۔ درگاہ امام حسین ومدرسہ ومسجد امام جعفرؑ صادق نور الٰہی، دہلی
۲۹۔ امام باڑہ ومسجد مدرسہ اہلِ بیت مصطفےٰ آباد، دہلی
۳۰۔ خیبر شکن اکاڈمی
۳۱۔ مرزا ویلفیئر سوسائٹی، دہلی



مغل شیعہ جامع مسجد سانکھنی

دورانِ مغل سلطنت سانکھنی میں جو مسلم آبادی تھی وہ مسجد و امام بارگاہ سے محروم تھی تعلیم کی کمی کے باعث دین و شریعت کے قوانین سے بھی بے بہرہ تھی۔ دوسری اقوام جو سانکھنی میں موجود تھیں ان کا اثر بھی مسلم قوم پر گہرا پڑا ہوگا۔ شہنشاہ ہندوستان بادشاہ محمد جہانگیر کا دور آتے ہی سانکھنی میں مسلم اکثریت کا عروج ہوا۔ لیکن سانکھنی میں جائے عبادت کی کوئی ظاہرہ عمارت تعمیر نہ تھی جس وجہ سے اہلِ سانکھنی یکجا نماز ادا کرنے اور عبادت الٰہی سے محروم تھے۔ بافہم مومنین نے خود عبادت الٰہی میں مصروف رہنے اور نجات کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے ایک خدا کا گھر بنانے کا ارادہ کیا۔ جس کی بنیاد تقویٰ (کی بنیاد) پر رکھی جائے۔ کہتے ہیں کہ کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ بستی کے تمام مومنین نے مل کر ۱۶۵۵ء میں رب العزت کے گھر کی سانکھنی کے مرکزی حصہ پر بنیاد رکھی اور اس کا نام مغل مسجد رکھا گیا۔ وقت گزرتا رہا مسلم قوم کی اکثریت بڑھتی رہی دیکھتے ہی دیکھتے سانکھنی میں اسلام کا عروج ہوتا چلا گیا۔ جب سے سرزمین ہندوستان پر جمعہ کی نماز ادا

کرنے کا حکم ہوا سانکھنی میں بھی نماز جمعہ قائم ہوئی۔نماز قائم ہوتے ہی مغل مسجد کا نام مغل جامع مسجد رکھا گیا۔شیعیت کا عروج ہوتا گیا اور دیگر مساجد اور امام بارگاہ کی طرف دھیان بڑھتا چلا گیا۔ایک زمانہ گزر جانے کے بعد مسجد کی بوسیدہ عمارت کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے لیے اہلِ بستی نے قدم بڑھایا۔لیکن اس کے لیے ایک اچھی رقم درکار تھی۔۱۹۵۴ء سے تھوڑا تھوڑا کام شروع ہوا، ۱۹۵۶ء میں علمائے دین سے اجازت وفتویٰ لے کر مسجد کو زمیں بوس کیا گیا اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک مسجد کو مغلیہ طرز پر از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔مومنین سانکھنی نے دل کھول کر چندہ دیا دو دو چار چار بیگھہ زمین مسجد کے لیے عطیہ کیں۔اس وقت مسجد کی تعمیر وتوسیع کے لیے ایک کروڑ روپئے سے زیادہ صرف ہوئے۔اس مسجد کا ایک تاریخی مقام ہے مغل جامع مسجد کا شمار صوبہ اتر پردیش کی مشہور ومعروف عمارات میں ہوتا ہے۔



مسجد عظیم بیگ

۱۸۵۴ء بلند شہر گزٹ کے اعتبار سے سانکھنی بستی میں ۶ مساجد کا ذکر ملتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی مساجد تھیں جن کا ذکر ضلع کی تاریخ میں موجود ہے۔ میرا جہاں تک اپنا خیال ہے وہ یہ ہے کہ جس مسجد میں وضو اور پاکیزہ پانی کے لیے پتھر کے کنویں بنے ہوئے تھے وہ مندرجہ ذیل مساجد ہو سکتی ہیں۔

(۱) مغل جامع مسجد

(۲) مسجد عظیم بیگ

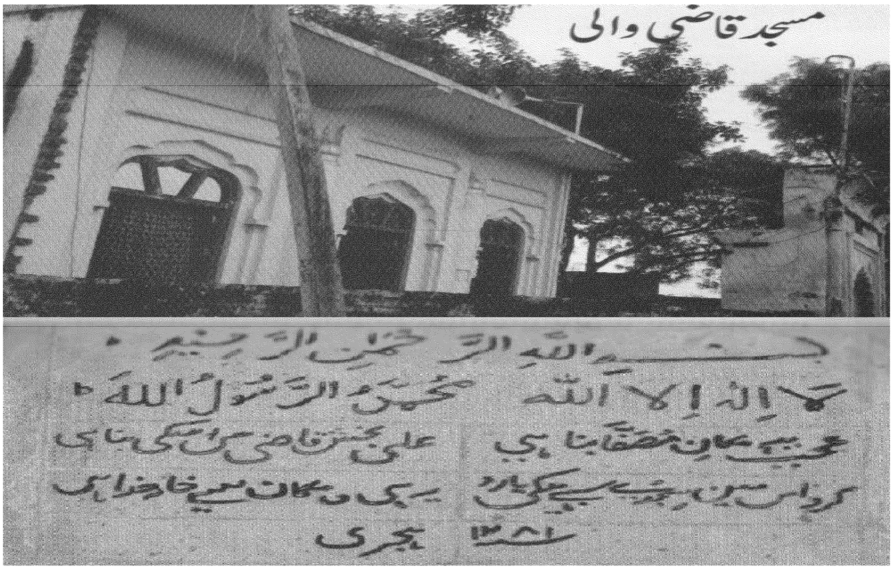
(۳) مسجد قاضی والی

(۴) مسجد درزی والی

(۵) مسجد منہاروں/لوہاروں والی

(۶) مسجد تکیہ والی

مسجد عظیم بیگ کی تعمیر کی تاریخ کے بارے میں تو صحیح علم نہیں ہو سکا لیکن ضلع کی تاریخ کے حساب سے اس مسجد کی تعمیر کو تقریباً ۱۵۰ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مسجد کو عالی جناب عظیم بیگ مرحوم ابن شہادت حسین مرحوم نے تعمیر کرایا تھا۔ سانکھنی کی آبادی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۹۹۶ء میں اس مسجد کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا اس مسجد کا سنگ مرمر کا خوبصورت اور وسیع صحن اپنی طرف کھینچتا ہے۔ انجمن حیدری کے زیر نگرانی یہ ایک بہت ہی خوبصورت مسجد بنائی گئی ہے جو کہ ضلع میں اپنی مثال آپ ہے۔



مسجد قاضی والی

جیسا کہ مسجد کے کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسجد کا سنگِ بنیاد ۱۸۶۴ء بمطابق ۱۲۸۱ھ میں رکھا گیا۔اس مسجد کی تعمیر قاضی علی بخش مرحوم نے کرائی تھی ۔مسجد بہت چھوٹی تھی اس کی ایک بار توسیع الحاج و کربلائی قاضی مقصود حسین کے ذریعہ ہوئی۔سانکھنی کی اکثریت کو دیکھتے ہوئے دوبارہ ازسرِ نو تعمیر کا خیال ذہن میں آیا جس کی تعمیر کا کام بہت تیزی کے ساتھ جاری ہے۔وابستگان انجمن حیدری میں سے قاضی خاندان ہی سے اس مسجد کا متولی ہوتا ہے۔اس مسجد کے موجودہ متولی ماسٹر قاضی محشر عباس ابن الحاج قاضی زوار حسین ہیں جو مسجد کے تعمیری فرائض کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔



کربلا سانکھنی

یہ ایک تاریخی عمارت ہے جس کو اہلِ بستی نے مل کر ۳۵۰ سال قبل تعمیر کیا تھا۔مغلیہ دورِحکومت میں جن کنکڑ نما پتھروں اور چونے کا استعمال ہوتا تھا وہ سب اسی عمارت میں ملتا ہے۔اس کی توسیع میں مستوراتِ سانکھنی کا بہت زیادہ تعاون رہا ہے۔ایام عزاء میں تمام تابوت وتعزیہ کربلا میں دفن ہوتے ہیں۔شہدائے کرب وبلا کی یاد تازہ رکھنے کے لیے گردونواح سے عقیدت مند حضرات کا تانتہ لگا رہتا ہے۔لاکھوں لوگ شرکت فرما کر ثوابِ دارین حاصل کرتے ہیں۔مقامی حضرات کی جانب سے بیرونی حضرات کے لیے پانی وشربت کی سبیلوں اور تبرک کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کربلا کیا ہے/ کسے کہتے ہیں اور اس سے ہماری زندگی کا کیا رشتہ ہے؟ ۱۴۰۰ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے کربلا پر لاکھوں قلم کاروں کے قلم اپنے علم کی ضوفشانی کر چکے ہیں اور نہ جانے رہتی دنیا تک کتنے قلموں کی روشنائی پھیکی پڑ جائیگی۔پھر بھی کربلا کی تعریف بیان نہیں ہوسکتی ہے۔ختم المرسلین حضرت محمد ﷺ کے پیارے نواسے حضرات امام حسینؑ اوران کے ۷۲ جانثاروں کی شہادت

اسی سرزمینِ کربلا پر ہوئی جو تاریخ میں ایک بہت بڑا خونِ ناحق تھا۔ اسی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے آج دنیا کے تمام ممالک سے کروڑوں کی تعداد میں زائرین کربلائے معلٰی حضرت امام حسینؑ کے روضہ مبارک کی زیارت کے لیے جاتے ہیں اور ثوابِ دارین حاصل کرتے ہیں جو حضرات خانگی اور مالی دشواریوں کے سبب حضرت امام حسینؑ کے روضہ کی زیارت سے محروم رہتے ہیں وہ خود کو بہت بدنصیب سمجھتے ہیں۔ کربلا اور اس کے واقعہ کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ہم کو واقعہ کربلا کے بعد قاتلانِ حسین کا جو عبرت ناک انجام ہوا اس کو سمجھنا ہوگا۔

مارائیت مثل ماوذی به اهل هذالبیت بعد نبیهم ؛ یعنی ہم نے کسی کو اتنی اذیت اٹھاتے نہیں دیکھا جتنی رسولؐ کے بعد رسولؐ کے اہلبیتؑ نے ایذائیں اٹھائی ہیں۔ **(تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۵)**

ظاہر ہے ایذاؤں کی حد نہیں معلوم ہوتی ہے ایک طرح کی نہیں طرح طرح کی ایذائیں ان کے سامنے پیش آتی گئیں، مگر آل محمدؐ سب کو برداشت کرتے رہے، واقعی آل محمدؐ کے صبر کے سامنے صبر ایوبؑ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، جناب مسلمؑ ابن عقیل کی شہادت کتاب کربلا کا دیباچہ ہے، کوفیوں نے ایک طرف جناب امام حسینؑ کو خط اور دوسری طرف حضرت مسلمؑ پر ظلم وستم ڈھائے، چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ابن زیاد نے حضرت مسلمؑ اور ان کے دونوں بیٹوں پر بے پناہ ظلم کئے، حضرت مسلمؑ کو دھوکے سے شہید کیا گیا اور ان کے دونوں بیٹوں کو بھی حارث کوفی نے بے دردی سے شہید کر کے ان کے سر ان کے جسم سے جدا کر دئے، ہر چند کوفیوں نے ابتدا میں حضرت مسلمؑ کی خاطر داریاں کی تھیں مگر جب یزید ابن

معاویہ کی طرف سے تشدد شروع ہوا تو اہل کوفہ حضرت مسلمؑ کا ساتھ نہ دے سکے، سلطنت کا زور بہت ہوتا ہے، عوام الناس، سلطنت کا مقابلہ نہیں کر سکتے، المختصر پھر حضرت مسلمؑ کا اس کو موقع نہیں ملا، کہ جناب امام حسینؑ کو اہل کوفہ اور ابن زیاد کے معاملات سے باخبر کرسکیں، چنانچہ جناب امام حسینؑ منزل بمنزل کوفہ کے قریب آ ہی گئے، جب منزل ثعلبیہ تک پہنچے بکر اسدی نے جو کوفہ سے آ رہا تھا، ساری حقیقت ابن زیاد کے تشدد اور حضرت مسلمؑ کی اور ان کے بیٹوں کی شہادت کا امام حسینؑ سے بیان کیا، یہ واقعہ حضرت مسلمؑ کی شہادت کا اسی روز کا ہے کہ جس روز مکہ سے آپ نے کوفہ کی طرف کوچ کیا تھا، لیکن جو قدم آگے بڑھ چکے تھے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے اگر واپس چلے جاتے تو تا قیامت یزید کی ناجائز خلافت کو باطل قرار دینے والا کوئی نہ ہوتا، اور آئندہ کے لئے حق و ناحق کے درمیان تمیز ہی مٹ جاتی اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تاریخ اسلام میں امت کی طرف سے سرزد ہونے والا سب سے بڑا اجتماعی گناہ واقعہ کربلا تھا۔ بدقسمتی سے یہ گناہ ان لوگوں سے ہوا جو اپنے آپ کو اسلام کا حامی اور مددگار سمجھتے تھے، حضرت عیسیٰ کے ساتھی حواری کہلاتے تھے لیکن جب ان پر آزمائش کا کڑا وقت آیا تو حواریوں نے انہیں چھوڑ دیا، تاہم حضرت امام حسینؑ کے خاص جانثار ساتھی اور گھر والے آخری دم تک ان کے ساتھ رہے، امام حسینؑ نے کہا بھی کہ وہ رات کے اندھیرے میں اِدھر اُدھر منتشر ہو جائیں، کیونکہ یزیدی لشکر کو امام حسینؑ کا سر درکار تھا لیکن

ان کے کسی ساتھی نے انہیں اکیلا چھوڑ کر جانے سے صاف انکار کر دیا، پھر یہ ہے کہ ایک طرف نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ اور ان کے بے سرو سامان ساتھی اور دوسری طرف رسول اللہؐ کی امت کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں کھڑے تھے اور اپنی بزدلی یا موقع پرستی کی بنا پر باطل کا ساتھ دے رہے تھے۔

میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے جن ساتھیوں نے ہتھیار لگا کر پیدل یا سوار یزیدی لشکر کا مقابلہ کیا، ان کی تعداد صرف بہتر تھی، باقی مستورات اور بچے تھے دوسری طرف ابن زیاد کا لشکر کم از کم تیس ہزار تازہ دم سر سے پاؤں تک مسلح افراد پر مشتمل تھا، اس تقابل کے باوجود اگر کوئی بدبخت بے لاگ تاریخ نویسی کے نام پر یہ کہتا ہے کہ یہ دو لشکروں کے درمیان جنگ تھی تو اس کی عقل و دانش کا ماتم کرنا چاہئے، چاروں طرف سے گھرے ہوئے، پیاس سے نڈھال، سفر سے خستہ حال یہ ستر بہتر افراد واقعی ایک لشکر تھے، ہاں انہوں نے حق کا علم بلند کرنے کے لئے جس بے جگری سے مقابلہ کیا اس کو دیکھتے ہوئے وہ بہتر افراد یزیدی لشکر کے لئے قہر آسمانی ثابت ہوئے اس موقع پر حضرت امام حسینؑ نے اہل عراق کو مخاطب کر کے کہا تھا:

اے لوگو! رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ایسے ظالم بادشاہ کو دیکھے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال جانتا ہو، اللہ کے عہد کو توڑتا ہو، سنت رسولؐ کے خلاف عمل کرتا

ہوا اور اللہ کے بندوں پر ظلم و جبر کرتا ہوا اور پھر بھی اسے اپنے قول و فعل سے روکنے کی کوشش نہ کرے تو وہ اللہ کے نزدیک مجرم ہے حتی کہ اللہ اسے دوزخ میں ڈال دے، تو آگاہ رہو اور ان لوگوں (یزیدی حکومت) نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی ہے اور رحمٰن کی اطاعت ترک کر دی ہے، فساد پھیلایا ہے اور حدود اللہ کو پامال کیا ہے، املاک پر قبضہ کیا ہے، حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دیا ہے، میرے پاس تمہارے خط آئے اور تمہارے آدمی میرے پاس تمہاری بیعت لے کر پہنچے، اس لئے میری سلامتی کی حفاظت تمہارا فرض ہے، مجھے ذلیل کرنا فرض نہیں اگر تم نے صدق دل سے میری بیعت کی تو ہدایت پاؤ گے کہ میں حسین ابن علیؑ اور فاطمہؑ بنت رسولؐ کا بیٹا ہوں۔

بالآخر جب قافلۂ حسینؑ کو لڑنے پر مجبور کر دیا گیا اور انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تو وہ لوگ کربلا کے میدان میں حق کا علم بلند کر کے باطل کے مقابلے کے لئے نکل آئے، اس موقع پر حضرت امام حسینؑ ذوالجناح پر سوار ہوئے اور اپنے خلاف صف آرا امت کے بدعہد لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ''اے لوگو! تم میرا نسب دیکھو اور سوچو میں کون ہوں، نہ غلاموں کی طرح ان کی بڑائی کا اقرار کروں گا اور نہ یزید کی بیعت کرونگا، خدا کے بندو! میں تمہارے ساتھ سنگسار ہونے سے بھی رب کی پناہ مانگتا ہوں''۔

چنانچہ کوفی سرداروں، خصوصاً شمر ابن ذوالجوشن نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپؑ

اپنے آپ کو بنی امیہ کے حکام کے حوالے کر دیں اور انکی اطاعت قبول کریں، آپ نے یہ مطالبہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

کربلا میں یزیدی لشکر نے امام حسینؑ کے مختصر سے قافلے کو گھیرا تھا، اس کی کمان عمر بن سعد ابن ابی وقاص کے پاس تھی، عمر بن سعد امام حسینؑ سے لڑنے کے لئے رضامند نہیں تھا، وہ امام حسینؑ سے مصلحتاً گفتگو کر رہا تھا، لیکن ابن زیاد کے دباؤ کے بعد وہ جنگ کے لئے تیار ہو گیا، ابن زیاد کا حکم تھا کہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر دریائے فرات کا پانی بند کر دیا جائے، اس مقصد کے لئے عمر بن سعد نے پانچ سو سوار نہر کے کناروں پر کھڑے کر دئے تھے عمر ابن سعد کا ارادہ جنگ کو زیادہ سے زیادہ ٹالنا تھا لیکن ابن زیاد کو اندیشہ تھا کہ تاخیر سے لوگوں پر امام حسینؑ کی باتوں کا اثر ہونا شروع ہو جائے گا، اس لئے اس نے عمر بن سعد کو آخری حکم دیا کہ اگر امام حسینؑ بلا شرط اس کے سامنے اطاعت میں سر جھکا دیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان پر حملہ کر دیا جائے، ابن زیاد کا ارادہ واضح طور پر امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کا تھا اور اس سلسلے میں یزید کو بری الذمہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا یہ فرض کرنا محال ہے کہ امام حسینؑ اور خاندان نبوت کے دوسرے تمام مردوں (جو اس وقت امام حسینؑ کے ساتھ تھے) کو قتل کرنے کا فیصلہ صوبے کے ایک گورنر نے محض اپنی ذاتی صواب دیند پر کیا ہوگا، مولانا مودودی نے اپنی کتاب: خلافت وملوکیت، میں مورخ حافظ ابن کثیر کے حوالے سے

یہ بالکل درست لکھا ہے کہ یزید کو قتل حسین سے واقعی اختلاف تھا یا اسے اس قتل پر ذاتی طور پر دکھ ہوا تھا؟

''تو پھر یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ اس عظیم ظلم پر اس نے اپنے گورنر کو کیا سزا دی؟ اس نے ابن زیاد کو نہ کوئی سزا دی، نہ اسے معزول کیا، نہ اسے ملامت ہی کا کوئی خط لکھا، اسلام تو بدرجہ بلند چیز ہے اگر یزید میں انسانی شرافت کی کوئی رمق ہوتی تو وہ سوچتا کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس کے پورے خاندان کے ساتھ کیا احسان کیا تھا اور اس کی حکومت نے ان کے نواسے کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

چنانچہ یہ تصور کرنے کے معقول وجود موجود ہیں کہ کربلا کے میدان میں نواسۂ رسولؐ اور اہلبیتؑ کے افراد کے ساتھ جو ظلم کیا گیا اس کے سلسلے میں ہدایت براہ راست دمشق سے دی جا رہی تھی، اس کا سب سے بڑا ثبوت اہل حرم کو شہادت امام حسینؑ کے بعد زندان میں قید و بند کی صعوبتیں دینا ہے جو یزید ابن معاویہ کا اختیاری عمل تھا اگر دمشق میں کسی نے اس سانحہ پر بعد میں افسوس کا اظہار کیا تھا تو وہ مگرمچھ کے آنسو تھے۔

جناب حر کے علاوہ بھی کئی لوگ تھے جو یزیدی فوج سے منحرف ہو کر امام حسینؑ کے لشکر میں شامل ہوئے اور پھر یزیدی فوج کے مخالف لڑے یہ چند لوگ تھے جن پر حق واضح ہو گیا، اکثریت وقتی مصلحت، خوف اور لالچ کے سبب حق کو ناحق سمجھنے کے باوجود یزید اور ابن زیاد

کا ساتھ دیتی رہی، وہیں دوسری طرف امام حسینؑ کے جانثاروں نے راہ حق میں اپنی شہادت کے نذرانے پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جیسا کہ محمد رضا مصری نے تحریر کیا ہے۔

حضرت امام حسینؑ کے ساتھی امام حسینؑ کو بچانے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پوری قوت سے دشمنوں کو روکتے اور ان سے لڑتے رہے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہایت دلیر اور بہادر تھے، دوسرے وہ امام حسینؑ کی عظمت وتکریم کو قائم رکھنا چاہتے تھے، تیسرے یہ کہ ان کے اعتقاد میں تھا کہ امام حسینؑ ہی خلافت کے حقدار تھے، علاوہ ازیں امام حسینؑ کے گھر والے آپؑ سے بڑی محبت کرتے اور آپؑ کو بزرگ مانتے تھے، آپ کے بعد اپنی زندگی کو بے مقصد و بے وقعت سمجھتے تھے (الحسن والحسین)۔

آپؑ کے ساتھیوں نے جانثاری اور شجاعت کی بہترین مثالیں قائم کیں، بعض نے قتل ہونے سے پہلے کئی درجن دشمنوں کو تہہ تیغ کیا، چونکہ اصحاب حسینؑ کی تعداد بہت قلیل تھی اس لئے اپنے مقتولوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر دشمن کی فوج نے انبوہ کرکے انہیں گھیر لیا اور قتل کرنا شروع کیا، شمر نے امام حسینؑ کے خیمے پر تیر برسائے اور پھر اس خیمہ میں آگ لگائی جس خیمہ میں مستورات تھیں، محمد علی ابن علی طبا طبائی لکھتے ہیں: ''دشمن فوج نے تمام اصحاب حسینؑ کو ختم کردیا اور جب تنہا امام حسینؑ باقی رہ گئے تو انہیں بڑی سخت جنگ کرنی پڑی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی، آخر امام حسینؑ کو بری طرح قتل کیا گیا، اس موقع پر

جو اقدار ظاہر ہوئیں وہ اس سے پہلے نظر نہ آئی تھیں، امام حسینؑ نے صبر، احتساب، بہادری، تقویٰ، جنگی آداب کا لحاظ اور بلاغت وغیرہ کے لاجواب نمونے دکھائے اور آپ کے ساتھیوں نے نصرت، تعاون، جانبازی اور ایک مقصد کے لئے جنگ کے نادر نمونے پیش کئے۔

شہادت امام حسینؑ، تاریخ اسلام کا ایک عظیم سانحہ ہے گذشتہ ڈیڑھ ہزار برسوں میں اس سنگین واقعہ پر ایک دو درجن نہیں بلکہ کروڑوں کتابیں، نظمیں، مرثیے اور نوحے وسلام لکھے جا چکے ہیں شاید ہی دنیا کا کوئی ادیب یا شاعر ایسا گذرا ہو جس نے اس واقعہ کی طرف توجہ و اظہار خیال نہ کیا ہو۔

یہ شہادت، حریت اسلام کی شہادت تھی، اس میں اسلام کی حیات نو تھی، لیکن واقعہ اس قدر دل دوز اور امت کے لئے اس قدر شرمناک تھا کہ گذشتہ چودہ صدیوں کا مسلسل ماتم بھی اس کی تلافی نہیں کرسکتا، علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب ''تاریخ الخلفاء'' میں لکھتے ہیں: آپ کی شہادت کا واقعہ بہت طویل اور دل گداز ہے جس کو لکھنے اور سننے کی دل میں طاقت نہیں ہے، امام حسینؑ کے ساتھ اٹھارہ بنی ہاشم، شہید ہوئے، آپ کی شہادت کے ہنگامے کے بعد سات دن تک اندھیرا رہا، دیواروں پر دھوپ کا رنگ زرد پڑ گیا اور بہت سے ستارے بھی ٹوٹے، آپ کی شہادت کے دن سورج، گہن میں آ گیا تھا، مسلسل چھ ماہ تک

آسمان کے کنارے سرخ رہے، بعد میں رفتہ رفتہ وہ سرخی جاتی رہی، البتہ افق کی سرخی جس کو شفق کہا جاتا ہے آج تک موجود ہے، یہ سرخی شہادت حسینؑ سے پہلے موجود نہیں تھی، بعض لوگ کہتے ہیں کہ شہادت حسینؑ کے روز بیت المقدس میں جو پتھر بھی اٹھایا جاتا تھا، اس کے نیچے تازہ خون نکلتا تھا لشکریوں نے اپنے اونٹ ذبح کئے تو اس کا گوشت آگ کی طرح سُرخ ہو گیا اور جب اس کو پکایا تو وہ کڑوا ہو گیا، ایک شخص نے امام حسینؑ کو بعد شہادت سب وشتم کیا تو بحکم الٰہی آسمان سے ستارے ٹوٹے وہ اندھا ہو گیا، ترمذی نے جناب سلمٰی سے روایت کی ہے کہ میں حضرت ام سلمٰی کے پاس گئی تو میں نے انہیں روتا ہوا پایا، میں نے سبب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ کا سر مبارک اور ریش مبارک غبار آلود تھی میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ میں آپ کو کس حال میں دیکھ رہی ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ میں نے ابھی ابھی حسینؑ کو شہید ہوتے ہوئے دیکھا ہے، آپؐ کے دست مبارک میں ایک شیشی ہے جس میں خون بھرا ہے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ حسینؑ اور اس کے ہمراہیوں کا خون ہے جو آج میں دن بھر جمع کرتا رہا ہوں، لوگوں نے جب اس خواب کے دن کا حساب لگایا تو وہ امام حسینؑ کی شہادت کا دن تھا''۔

امام عالی مقام نے بقائے لا الٰہ کے لئے اپنی جان دے دی لیکن باطل کے ہاتھ میں

اپنا ہاتھ نہیں دیا، اس لئے رہتی دنیا تک ان کا یہ کارنامہ بقائے دوام حاصل کر چکا ہے، امام حسینؑ اوران کے ساتھی دس محرم اکسٹھ ہجری کو شہید ہوئے، اتفاق سے اسی روز شمسی سال کے مہینہ اکتوبر ۶۸۰ء کی بھی ۱۰ رتاریخ تھی، حضرت امام حسینؑ کے ساتھیوں نے اپنے امام پر قربان ہونے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کی، جب تک آپؑ کا آخری وفادار ساتھی شہید نہیں ہو گیا کوئی دشمن آپؑ تک نہ پہنچ سکا، آخر میں آپ کے بھائی عباسؑ علمدار نہر فرات پر تنہا دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے، عباس علمدار کو کربلا میں تلوار سے جنگ کی اجازت نہیں ملی، اس کے بعد امام حسینؑ اکیلے رہ گئے، یا پھر خیمے میں مستورات اور بیمار امام زین العابدینؑ باقی رہ گئے تھے، دشمن کا ارادہ اپنے رسولؐ کی نسل ختم کرنے کا تھا، جب زخمی حسینؑ تنہا میدان کربلا میں رہ گئے تو دشمنوں نے آپ کو گھیر لیا لیکن کسی کو ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ نواسہ رسولؐ پر مہلک وار کرے، جو بھی آگے بڑھا اس کا دل دہل جاتا آخر ایک بدبخت عراقی مالک بن سنان کندی نے آپؑ پر تلوار سے حملہ کیا، آپ کا سر زخمی ہوا، پھر ایک بدبخت شخص عمر الطھوی نے آپؑ کی طرف تیر پھینکا، آپؑ کاندھے سے وہ تیر نکال ہی رہے تھے کہ ایک اور سفاک زرعہ بن شریک تمیمی نے نے آپؑ کے ہاتھ پر تلوار کا وار کیا پھر سنان ابن انس نامی شخص نے آپؑ کو شدید زخمی کر دیا اور آپؑ نیچے گر گئے، ایک ملعون شخص خولی ابن یزید اصحی آپؑ کا زخمی حال میں سر کاٹنے کے لئے آگے بڑھا مگر خوف زدہ ہو کر کانپنے لگا،

اس پر آپؑ کو گرانے والا شقی القلب سنان ابن انس بھاگ کر آیا اور آپ پر تلوار سے وار کیا، اس کے بعد شمر بن ذی الجوشن نے آپ کا سر قلم کر دیا۔ جب امام حسینؑ قتل ہوئے تو آپ کے جسم اطہر میں تیروں اور تلواروں و دیگر اسلحوں کے بے شمار زخم تھے، سر کاٹنے کے بعد شمر پر اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ اس نے فوراً آپ کا کٹا ہوا سر خولی کے حوالے کر دیا اور باقی جسم وہیں چھوڑ دیا، اس کے بعد لوگ آپؑ کے خیمے پر ٹوٹ پڑے اور سب کچھ لوٹ لیا، مستورات کے زیور کپڑے تک چھین لئے، خولی آپؑ کا سر مبارک لے کر کوفہ آیا تا کہ ابن زیاد کے سامنے پیش کر کے انعام حاصل کرے لیکن اس وقت رات ہو چکی تھی، اس لئے رات کو اپنے گھر چلا گیا اور سر مبارک ایک طشت میں رکھ دیا، بیوی نورا بنت مالک نے پوچھا: یہ کس کا سر لے آئے ہو، جب اسے معلوم ہوا تو خاوند سے کہا: تیرا برا ہو، لوگ سونا چاندی لاتے ہیں اور تو نواسۂ رسولؐ کا سر لایا ہے، خدا کی قسم! میں تیرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

نورا اس واقعہ کا حال بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: پھر میں بستر سے اٹھ کر صحن میں آ گئی تو خولی نے دوسری زوجہ اسدیہ کو بلایا، وہ اس کے پاس آئی اور میں صحن میں بیٹھی سر مبارک کو دیکھ رہی تھی، خدا کی قسم! جب تک میں دیکھتی رہی ایک نور ہی نظر آتا رہا جو آسمان سے اس پانی کے طشت تک ستون کی طرح پھیلا ہوا تھا اور میں نے ایک سفید پرندہ دیکھا جو سر مبارک کے اردگرد اڑ رہا تھا۔ (بحوالہ تاریخ طبری)

آپؑ کا سر مبارک دشمنوں کے ہاتھوں میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک گھومتا رہا، مخالف کا سر کاٹنے اور اس کی نمائش کرنے کی رسم بد کی ابتدا بنی امیہ نے کی تھی، صبح ہوئی تو خولی نے سر مبارک ابن زیاد کے سامنے پیش کیا، ابن زیاد کے ہاتھ میں چھڑی تھی، وہ چھڑی کی نوک سے امام حسینؑ کے دانتوں کو کچھ دیر تک ضرب لگاتا رہا، اس وقت وہاں صحابی رسولؐ زید ابن ارقم موجود تھے، وہ خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے غصّے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے ابن زیاد سے کہا: ''اے ابن زیاد! تو ان مبارک دانتوں پر چھڑی مارنے سے باز آجا، اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ کے ہونٹوں کو ان ہونٹوں پر بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے''۔

یہ کہتے ہوئے وہ عمر رسیدہ صحابی بے اختیار رونے لگے، ابن زیاد بھری مجلس میں اس طرح ٹوکے جانے پر غصّے سے تلملانے لگا اور زید ابن ارقم سے کہا: ''خدا تیری آنکھوں کو رلاتا رہے، خدا کی قسم! اگر تو بوڑھا نہ ہوتا میں ابھی تیری گردن اڑا دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ بڑھاپے کے سبب تیری عقل جاتی رہی ہے''۔

ابن زیاد نے کچھ اور بھی گستاخانہ باتیں کہیں، یہ قلم ان باتوں کو دہرانے کی ہمت نہیں رکھتا، ظاہر ہے کہ یزید کی تائید اور حمایت کے بغیر وہ اس طرح کی گستاخی اور ذلیل حرکت نہیں کرسکتا تھا، فطرتاً بھی ابن زیاد ایک مجرم، بدطینت، سنگدل اور ظالم شخص تھا، اس

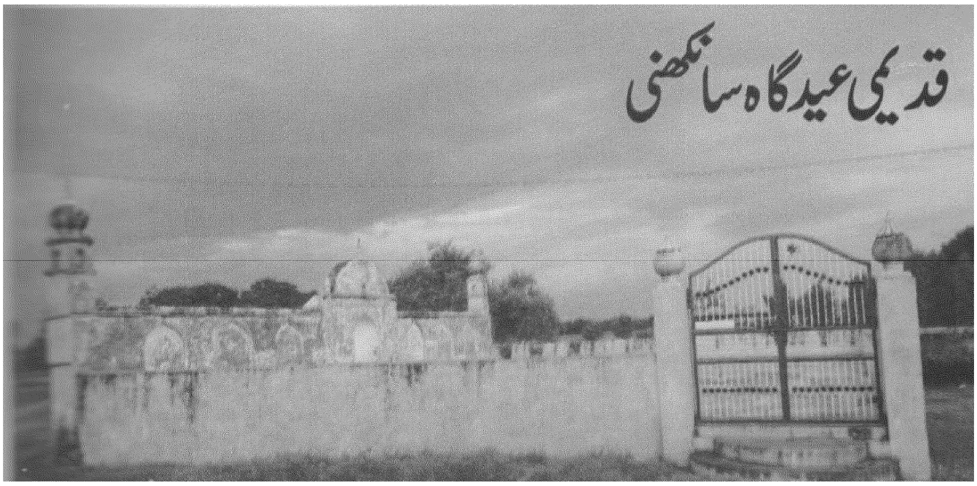
کے دل میں رحم دلی اور مہربانی کے جذبات تھے ہی نہیں، محمد رضا مصری نے اپنی کتاب الحسن والحسینؑ میں اس کے تعلق سے لکھا ہے: ''وہ لوگوں کو گالیاں دیتا تھا، اپنے ہاتھوں سے مارتا تھا، قتل کرنے اور سولی پر لٹکانے کا بے رحمی سے حکم دیتا تھا اور ذرا بھی درگذر نہ کرتا تھا، وہ اشراف اور اکابر کے سر کاٹ کر اس لئے یزید کے پاس بھیجتا تھا کہ یزید اس پر خوش ہوگا جب اس نے ابن عقیل اور ہانی کے سر بھیجے تو یزید نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یزید قتل کرنے، ظلم وستم روا رکھنے اور دہشت گردی کی پالیسی پر ابن زیاد کی حوصلہ افزائی کرتا تھا، امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں اور گھر والوں (جو شہید ہوئے) کے بہتر سر بھی ابن زیاد نے اسی لئے یزید کے پاس بھیجے تھے۔

چنانچہ یزید کو اس کارروائی سے ہرگز بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا جو ابن زیاد، ابن سعد، شمر اور سنان وغیرہ نے حضرت امام حسینؑ کو قتل کرنے سے پہلے ان کی توہین اور قتل کرنے کے بعد ان کے سر اور جسم مبارک کی بے حرمتی کرتے ہوئے کی، سرِ حسینؑ کی کوفہ میں تشہیر کی گئی، اس کے بعد سر مبارک کو شہدائے کربلا کے دوسرے بہتر سروں کے ساتھ دمشق میں یزید کے پاس روانہ کر دیا گیا، میدانِ کربلا میں امام حسینؑ کے جسم کی بھی شدید توہین اور پامالی کی گئی اس وقت یزیدی لشکر نے جو کچھ کیا کافر اور مشرک بھی کبھی ایسا نہ کرتے، بدبخت سالار لشکر ابن سعد کے حکم پر دس سوار آپؑ کے جسم کو روندنے لگے، آپؑ کے جسم اطہر سے

کپڑے تک اتار لئے گئے، ان بدبختوں نے اپنے گھوڑوں سے امام حسینؑ کا جسم پامال کیا اور اس طرح کہ آپؑ کے سینہ اور پشت کو چور چور کر دیا، (طبری) اہل بیت کی خواتین کی سخت توہین کی گئی، ان کی چادر تک سروں سے چھین لی گئیں، میدان جنگ سے انہیں کوفہ اور پھر دمشق یزید کے پاس روانہ کر دیا گیا، امام حسینؑ کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک امت کا ایک اجتماعی گناہ تھا، تاہم انفرادی طور پر جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر اس واقعہ میں حصہ لیا، ان کا انجام بھی بہت عبرتناک ہوا، عبداللہ بن ابی حصین نے امام حسینؑ کو فرات کے پانی سے روکا تھا اور طنز کیا تھا، آپ نے اس کے لئے بددعا کی اور وہ اس حالت میں مرا کہ مٹکے پانی پلائے جاتے تھے اور وہ پیاس پیاس پکارتا تھا، یہاں تک کہ پیٹ پھٹنے سے مر گیا، اسحاق حضری نے شہادت کے بعد آپ کے جسم سے کپڑے نوچے تھے وہ کوڑھ میں مبتلا ہوا۔ شمر مبروص ہو گیا اور آخر میں بہت بری طرح قتل ہوا، آپؑ کے کٹے ہوئے سر کو ابن زیاد کے سامنے پیش کرنے والا دردناک انجام سے دوچار ہوا اسے قتل کر کے اس کی لاش جلائی گئی، عمر ابن سعد کے ساتھ بھی وہی ہوا، ابن زیاد ذلت کی موت مارا گیا، ایک شخص نے اس کی لاش دیکھی جس کے دونوں ہاتھ مشرق اور پاؤں مغرب کو مڑے ہوئے تھے، عجب عبرت کا منظر تھا، ہر وہ شخص جس نے حضرت امام حسینؑ اور اہلبیتؑ کے قتل یا اہانت میں حصہ لیا، دنیا میں ذلت سے جیا اور ذلت کی موت سے دوچار ہوا، قتل سے پہلے امام حسینؑ نے ان لوگوں کے

لئے یہ بد دعا کی تھی:

''خداوند! ان لوگوں کو آسمان کی بارشوں سے اور زمین کی برکتوں سے محروم کر دے اگر تو انہیں کچھ مہلت دے تو ان میں تفرقہ ڈال دے ان کو فرقہ فرقہ کر کے متفرق کر دے، ان کے احکام کو ان سے کبھی راضی نہ ہونے دے''۔



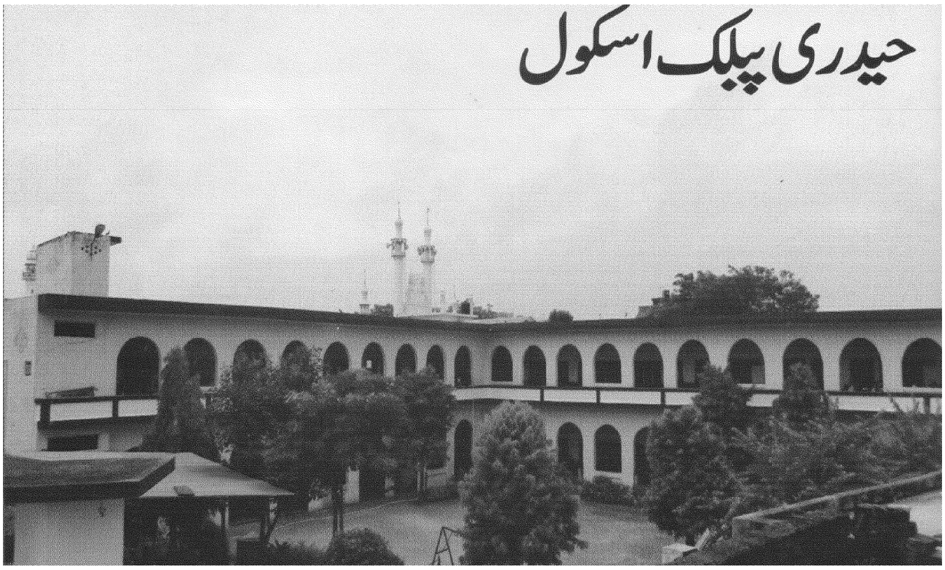
قدیمی عیدگاہ سانکھنی زیرِ نگرانی انجمن حیدری (رجسٹرڈ) سانکھنی

قدیمی عیدگاہ سانکھنی کے بارے میں کوئی پختہ تعمیری ثبوت مہیا نہیں ہوا ہے، اس کی قدامت کی صرف ایک نشانی یہ ہے کہ یہ کنکڑوں (پتھروں) کی بنی ہوئی ہے جو زمانہ قدیم میں تعمیری کام میں استعمال کیے جاتے تھے۔ اندازہ ہے کہ جس وقت مغل مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا یہ عیدگاہ بھی اسی وقت کی بنی ہوئی ہے۔



مسجد تکیہ والی

سانکھنی کی تاریخ میں اثناء عشری واہلِ سنت والجماعت ہمیشہ سے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلتے ہیں۔ یہ سانکھنی کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبصورتی ہے۔ آج سے تقریباً ۱۵۰ سال قبل اہلِ سنت والجماعت نے مسجد کی کمی کو محسوس کیا تو اہلِ سانکھنی نے یکجا ہو کر اس مسجد کی بنیاد رکھی اور تعمیر کے بعد اس مسجد کو اہلِ سنت والجماعت کے حوالے کر دیا گیا یہ سانکھنی کے اسلامی اتحاد کی پہلی مسجد تھی۔ مسجد بہت چھوٹی ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اہلِ سنت والجماعت نے اس مسجد کو سنّی وقف بورڈ کی تحویل میں دے دیا جس کی وجہ سے تعمیر نو پر عمل نہیں ہو سکا۔ اس مسجد میں بھائی سلمانی، بھائی قصار اور بھائی نجار نماز ادا کرتے ہیں۔

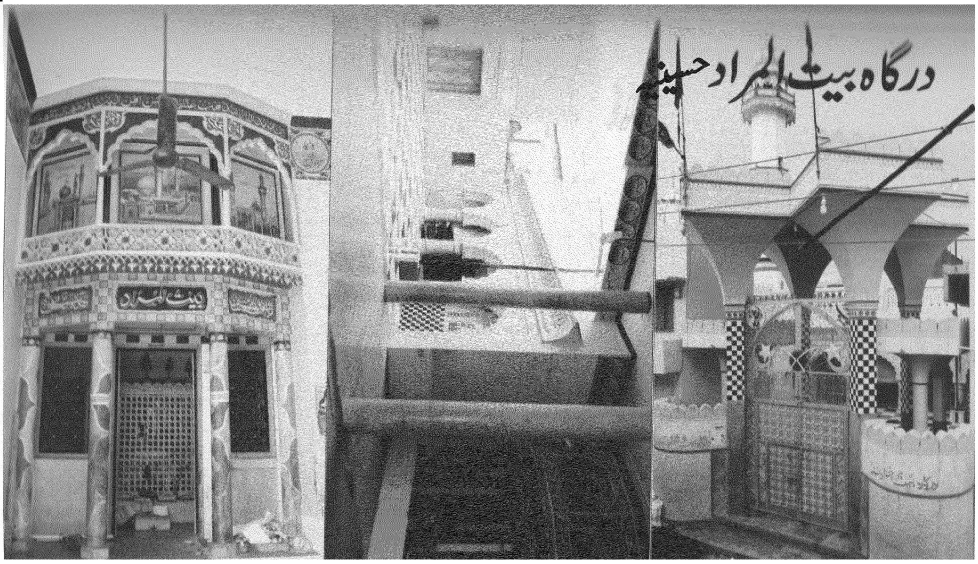


حیدری پبلک اسکول

دورِ حاضر کی تعلیم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انجمن حیدری کے زیرِ نگرانی حیدری پبلک اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس ابتدائی اسکول کو قائم ہوئے ۲۰ ؍سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے افتتاح کی رسم بڑی شان و شوکت سے ادا کی گئی۔ جس کو دیکھنے سے اہلِ سانکھنی کے دلوں میں خیال بھی مستحکم ہوگیا کہ وہ دن بھی اب نہایت قریب ہے کہ درسگاہوں کی وہ صورت جواب تک حجاب میں ہے، منصۂ ظہور پر جلوہ گر ہو۔ جس عالیشان جلسے میں یہ رسم ادا کی گئی وہ جلسہ عجب خوشی سے بھرا معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص کے دل میں سرور تھا۔ اچھے اچھے ذی رتبہ لوگ اس وقت محبتِ قومی کے جوش سے بھرے ہوئے تھے اور ان کی ہمدردی کے جوش پر در و دیوار سے بھی صدائے آفریں نکلتی تھی۔ خاکسار بھی مع جناب سید انور علی زیدی، سابق رجسٹرار، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ اس افتتاح میں شریک تھا۔ مرزا محمد علی مرحوم کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے والے اُن کے فرزندِ اصغر مرزا فردوس علی بھی موجود تھے۔ مرزا فردوس علی کی اہلیہ محترمہ چاند بانو اس وقت سانکھنی کی گرام پردھان تھیں۔ انھوں نے گرام سبھا کی زمین کو اسکول

کے لیے مہیا کیا اور دورِ حاضر کے تعلیمی تقاضوں کو عملی جامہ پہنانے کا ایک مستحکم ارادہ کیا۔ حیدری پبلک اسکول کی بنیاد ۲۰۰۰ء میں جناب مولانا شیخ محمد عسکری، مولانا مرزا قربان علی، جناب مرزا فردوس علی، بی جے پی منتری جناب سنگھ پریا گوتم اور بی جے پی منتری جناب شاہنواز حسین بھارت سرکار نے مشترکہ طور پر مل کر رکھی۔ انجمن حیدری کے لیے اسکول کی بنیاد کے بعد سب سے بڑا مسئلہ تعمیر کے لیے مالی تعاون کا تھا۔ اس کے لیے جناب مرزا محمد ثقلین صاحب نے اپنے بچپن کے دوست مرزا توقیر حسین ابن مرزا شبیر حسین (حال مقیم امریکہ) سے بات کی۔ انھوں نے بھرپور تعاون کے لیے یقین دلایا اور جو بھی ان سے ہوسکتا تھا انہوں نے اسکول کی عمارت کے ساتھ اسکول کی ہر طرح سے مدد فرمائی۔ اس کی تعمیر میں ایم۔ ایل۔ اے۔ رہے جناب ہوشیار سنگھ صاحب نے بھی بھرپور تعاون فرمایا۔

دورِ حاضر کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے آج جو ہمارے بچے حیدری پبلک اسکول سے کسب علم کر رہے ہیں یہ سب مرزا فردوس علی ابن مرزا محمد علی مرحوم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انجمن کے اہم ذمہ داران اور مرزا محمد ظاہر حسین ابن مرزا مظاہر حسین مرحوم نے بھی مرزا فردوس علی کا تہہ دل سے ساتھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حیدری پبلک اسکول آج اس علاقے کی نئی پہچان بن کر ابھرا ہے۔



درگاہ بیت المراد حسینیہ

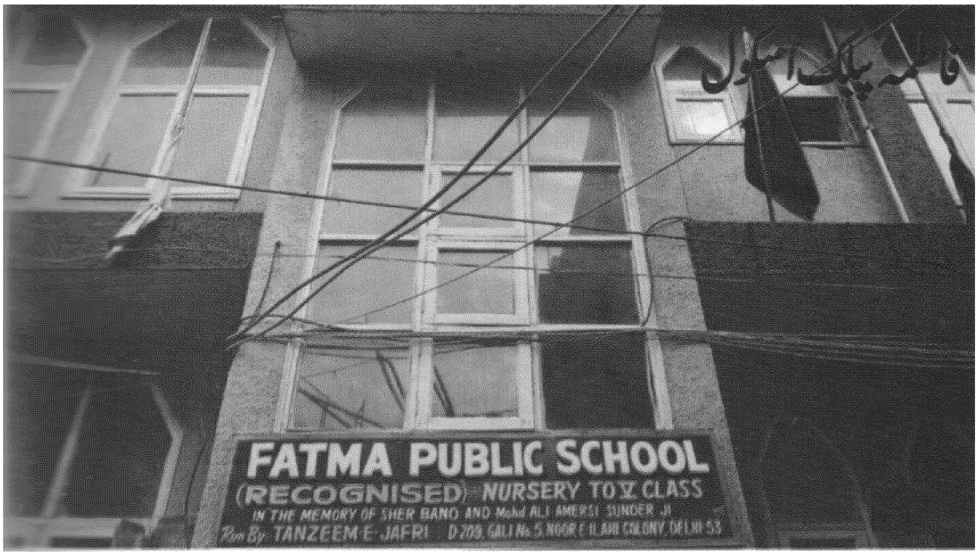
سانکھنی سرزمین پر جو سب سے پہلے درگاہ قائم ہوئی وہ درگاہ بیت المراد حسینیہ ہے۔اس امام بارگاہ کو پہلے امام باڑہ شرقی کے نام سے جانا جاتا تھا جس کی عمارت کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ بزرگان سانکھنی اس امام بارگاہ کی بنیاد تقریباً ۳۰۰۔۲۵۰ سال قبل کی بتاتے ہیں۔ دوبارہ اس درگاہ کی توسیع تقریباً ۱۹۲۵ء میں کی گئی جس کا کچھ حصہ آج بھی موجود ہے۔قوم کی کثرت کو دیکھتے ہوئے انجمن حیدری کے کارکنان کو اس درگاہ کو ازسرِ نو تعمیر کرانے کا خیال پیدا ہوا جس کے لیے زمین اور مالی تعاون کی ضرورت تھی۔ زمین کو شری گوری شنکر وارشنے صاحب سے مناسب قیمت پر لیا گیا۔درگاہ کی تعمیر سے پہلے شرقی حصے کے ہر امیر و غریب حضرات سے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ بہت سے اشخاص نے بیت المراد حسینیہ کے لیے اپنی جائیداد وقف کیں۔اس وقت کی موجودہ عمارت کی آخری تعمیرِ نو مئی ر ۱۹۷۳ء میں ہوئی تھی۔درگاہ میں حضرت امام حسینؑ کے روضہ مبارک کی شبیہ لائقِ دید ہے۔اس کے علاوہ جنابِ زینب سلام اللہ علیہا کا روضہ اور جنابِ سکینہ سلام اللہ علیہا کا روضہ مبارک ہے۔موجودہ کمیٹی نے بیت المراد کی تیسری بار توسیع کے لیے دسمبر ۲۰۱۶ء میں برابر کے مکان کو پچیس لاکھ روپے میں خرید کیا ہے۔

بیت المراد حسینیہ کی عمارت جاپانی و مغلیہ فن تعمیر کی منھ بولتی تصویر ہے۔



درگاہ مصطفےٰ آباد، دہلی

علاقہ جمنا پار مصطفےٰ آباد کالونی، دہلی میں مقیم حضرات جو انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی سے وابستہ ہیں ان کی کوششوں کے نتیجہ میں اس درگاہ کا سنگِ بنیاد ۱۹۸۴ء میں رکھا گیا۔ اس عمارت میں درگاہ، مسجد اور ایک عالیشان مدرسۂ اہلِ بیتؑ ہے جس کو ۲۰۰۹ء میں بہت خوبصورتی کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے تعمیری کام میں محنت ومشقت کے لیے محترم قائم حسین مکھیا، جناب افسر حسین مکھیا، جناب شاکر حسین مکھیا، جناب ماسٹر مرزا یوسف علی ابن مرزا مونس علی مرحوم اور جناب انصاف علی تیل والوں کا نام ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ رب العزت ان کی روزی میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!



فاطمہ پبلک اسکول، نورِ الٰہی، دہلی

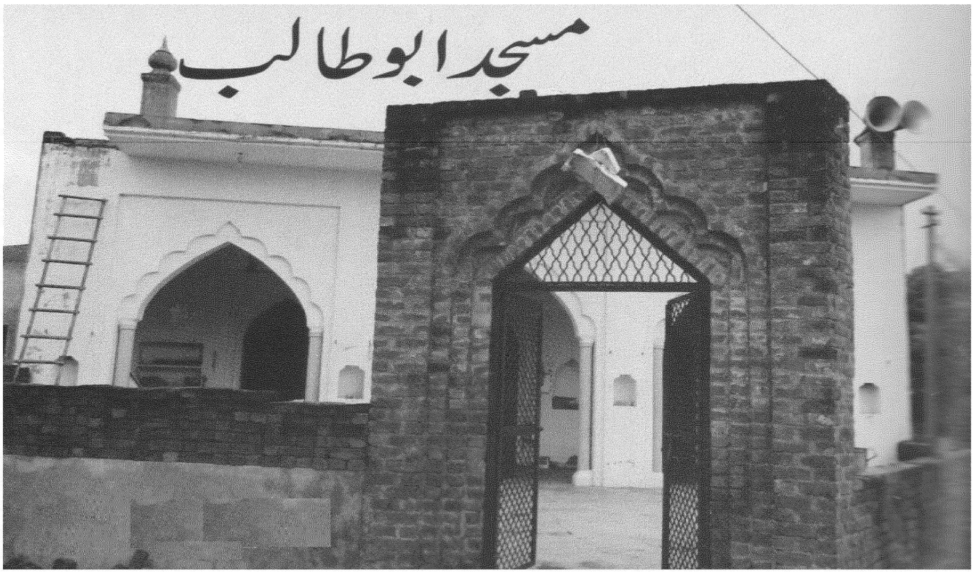
علاقہ جمنا پار نور الٰہی کالونی، دہلی میں مقیم حضرات جو انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی سے وابستہ ہیں ان کی کوششوں کے نتیجہ میں اسکول کا سنگِ بنیاد ۱۹۹۸ء میں رکھا گیا۔ اس کی تعمیر کے لیے مالی امداد فراہم کرانے میں محترم ماسٹر صفدر رضا صاحب کا نام قابل تعریف ہے۔



حیدری ہال، دہلی

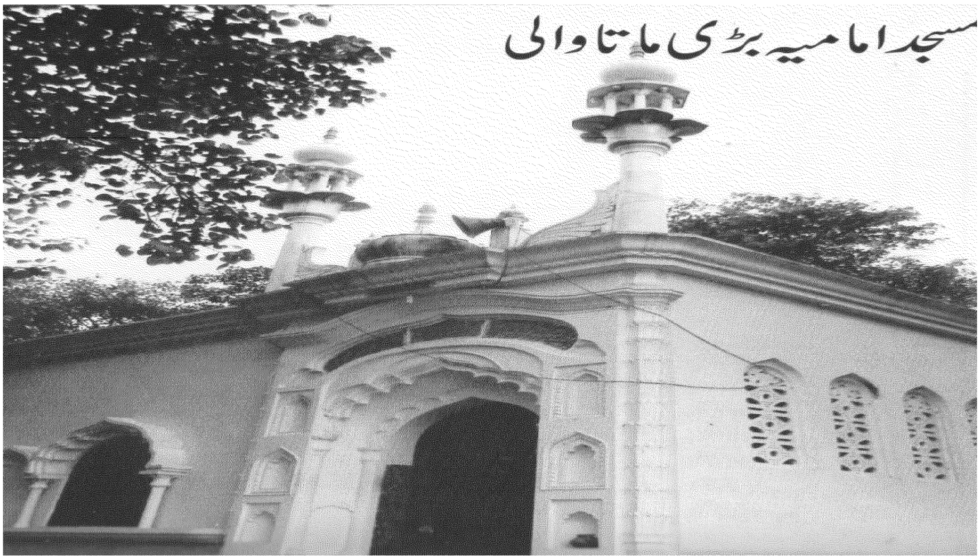
سانکھنی کی آبادی کا تقریباً ۶۰۔۶۵ رفی صد افراد پر مشتمل حصہ اپنے ذریعہ معاش کے سلسلے میں دہلی میں مقیم ہے جو کہ ہندوستان کی آزادی سے قبل دہلی میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ آزادی سے قبل ہی انجمن حیدری کی دہلی برانچ کا قیام عمل میں آ گیا تھا جس کا دفتر کشن گنج دہلی تھا۔ جس وقت ۱۹۶۲ء میں انجمن حیدری کا رجسٹریشن عمل میں آیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انجمن حیدری برانچ کو گلی شاہ تارا اجمیری گیٹ منتقل کیا گیا۔ انجمن حیدری کے اشخاص کی بیشتر تعداد جمنا پار آباد ہے۔ گلی شاہ تارا میں جگہ کی کمی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انجمن حیدری کے برانچ آفس کو برہم پوری جمنا پار منتقل کیا گیا۔ فروغِ عزاء و دینی تعلیم کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے جمنا پار میں ایک مناسب جگہ کا خیال پیدا ہوا جس کے لیے انجمن کے ذمہ داران حضرات نے دہلی میں مقیم سانکھنی کے تمام حضرات کے ساتھ ایک میٹنگ کی۔ جگہ کی خرید و باشندگانِ سانکھنی کی سہولت کو دیکھتے ہوئے برہم پوری دہلی میں تجویز پیش کی گئی اور اکثریت کے ساتھ قرار داد کو منظور کیا گیا۔ چندہ اکٹھا کر زمین کو خریدا گیا اور ۱۹۹۷ء میں

حیدری ہال کی بنیاد عمل میں آئی۔ آہستہ آہستہ ایامِ عزاء کے تمام پروگرام حیدری ہال میں منعقد ہونے لگے۔۱۹۹۸ء میں انجمن نے اسلامی تعلیم کے لیے حیدری ہال میں ایک اسلامی مدرسے کی بنیاد رکھی جہاں ایک بڑی تعداد میں بچے دینی تعلیم حاصل کرر ہے ہیں۔قوم کی اکثریت کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر حیدری ہال میں جگہ کی کمی کومحسوس کیا گیا جس کے لیے سوا کروڑ روپے میں قریب کے گھر کوخریدا گیا اور از سرِ نو تعمیر شروع ہونے سے قبل محبّان اہلِ بیت نے دل کھول کر چندہ دیا اور کام کو منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ایامِ عزاء کے دوران تمام پروگرام اسی ہال میں منعقد ہوتے ہیں۔



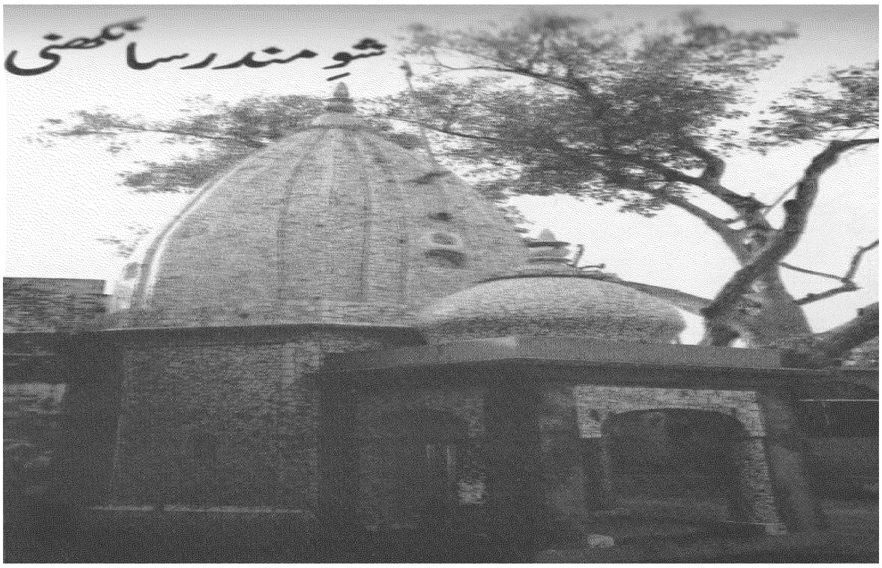
مسجد ابو طالبؑ

وقت کے ساتھ مسجد ابو طالبؑ کا سنگِ بنیاد مولانا مرزا قربان علی صاحب، پیش نماز شیعہ مسجد اوکھلا ئی دہلی کے دستِ مبارک سے ستمبر ۲۰۰۳ء کو عمل میں آیا۔ اس مسجد کی تعمیر میں وابستگانِ انجمن حیدری، بلّو خاندان کا بہت بڑا تعاون ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے اس مسجد کی تعمیر اسی خاندان کے ذریعہ عمل میں آئی ہے۔ مسجد کو بہت خوبصورتی کے ساتھ بنایا گیا ہے۔



مسجد امامیہ (بڑی ماتا والی)

یہ ایک چھوٹی مصلہ نما مسجد تھی، جو زمانۂ قدیم سے بنی ہوئی تھی سانکھنی کربلا سے نزدیک ہوتے ہوئے اور ایامِ عزاء میں بیرونی حضرات کی عبادت کا خیال کرتے ہوئے اس کی تعمیر نو کا خیال وابستگانِ انجمن حیدری میں پیدا ہوا۔ مسجد سے وابستہ حضرات نے ۲۰۱۱ء میں عالیجناب مولانا محمد جعفر واعظ مظفر نگری، امام جمعہ والجماعت مغل شیعہ جامع مسجد کے دستِ مبارک سے اس مسجد کے سنگِ بنیاد کا اہتمام کرایا گیا۔ اس چھوٹی سی مسجد کی خوبصورتی جو قریب سے دلکش نظر آتی ہے اپنی طرف کھینچتی ہے۔



مہادیو مندر (شوِ مندر) سانکھنی

ایک زمانہ گزرا سانکھنی میں آریہ، برہمن، ویش اور لودھ وغیرہ جاتی کا اقتدار تھا۔ مہادیو مندر اسی دور کی نشانی ہے جس کو تعمیر کئے ہوئے تقریباً ۲۵۰۔۳۰۰ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ ضلع کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پختہ تعمیر ۱۵۰ سال قبل عمل میں آ چکی تھی۔ اس کی تاریخ کو جاننے کے لیے کندن پور (اہار) کی تاریخ کو سمجھنا ہوگا۔ ہستنا پور پر جس وقت کورو پانڈوں کی حکومت تھی کندن پور انھیں کی ملکیت میں شامل تھا۔ جہاں گنگا ندی پر اونتکا دیوی کا مندر ہے جو کہ بلند شہر سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر دوری پر واقع ہے۔ یہ مندر زمانۂ قدیم سے ہندو مذہب میں ایک پوتر پوجا استھل مانا جاتا ہے جہاں پر دور دراز سے آنے والے ہندو حضرات کا ریلا لگا رہتا ہے۔ کیوں کہ سانکھنی بھی ایک قدیم بستی ہے جو کہ بلند شہر سے تقریباً ۳۵ کلو میٹر جہانگیر آباد اہار شاہراہ پر واقع ہے جو لوگ اونتکا دیوی پر جل چڑھانے دور دراز سے آیا کرتے تھے ان کا قیام سانکھنی مہادیو مندر پر ہوا کرتا تھا۔ مندر ایک کھلی جگہ

پر بنا ہوا تھا اور مندر کے اطراف میں بہت سی خالی جگہ موجود تھی جو کہ مندر سے منسوب تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد تقریباً ۷۲۔۱۹۷۱ء تک میں نے خود اپنے بچپن میں اس زمین پر پیداوار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مندر پر ساون کے مہینے میں بہت زیادہ رونق رہتی تھی اور کاوڑی جب اپنی کاوڑیں لے کر یہاں سے گزرتے تھے ان کے ٹھہرنے اور طعام کا انتظام بستی کے لوگ مل کر کرتے تھے۔

آہستہ آہستہ ہندو حضرات کا اپنے کاروبار کے سلسلے میں ادھر اُدھر بسنا شروع ہوا۔ مندر کی رونق بھی جاتی رہی۔ اطراف میں جو مندر سے لگی ہوئی زمین تھی اس کو بھی ویش حضرات نے اہلِ بستی کو فروخت کر دیا اور جو باقی ہندو حضرات سانکھنی میں موجود رہے ان کی اقتصادی حالت بہت کمزور تھی جس کی وجہ سے کافی عرصے تک یہ تاریخی مندر بوسیدہ حالت میں پڑا رہا۔ آج جب کہ بستی کے ہندو بھائیوں کے اقتصادی حالات بہتر ہوئے ہیں مندر کو بھی ایک نئی زندگی ملی ہے۔ مغرب میں سڑک کی جانب جو مندر کا دروازہ تھا اس کو بستی کے مسلمان بھائیوں نے اپنی کوشش سے کھلوا دیا ہے۔ اس کا صدر دروازہ مشرق کی طرف ہے، صدر دروازہ کے قریب مندر کے شمالی کنارے پر ایک پرانا کنواں تھا جو کہ تیرتھ یاتریوں کے نہانے دھونے میں استعمال ہوتا تھا۔ سانکھنی میں ہندو مسلم بھائی چارہ صدیوں سے قائم ہے۔ باہری اختلاف ہونے پر آپس میں ہندو مسلم حضرات ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمیشہ ہندو مسلم یکجہتی سانکھنی کی مثال رہی ہے اور انشاء اللہ رہے گی۔

مرزا محمد علی

نہ جانے کتنے چراغوں کو مل گئی شہرت
اک آفتاب کے بے وقت ڈوب جانے سے

سانکھنی کی تاریخ میں مرزا محمد علی کا نام کسی تعارّف کا محتاج نہیں انہوں نے اپنی تمام تر زندگی اپنے وطن اور قوم کے لئے وقف کر دی جن کی زندگی کا اصل مقصد قوم کی فلاح و بہبودی تھی گاؤں کا پردھان رہتے ہوئے وطن کی فلاح و بہبودی کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ رہتی دنیا تک یاد کئے جائیں گے ایک مدّت تک انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے موصوف نہایت ملنسار اورصوم صلواۃ کے پابند تھے سکریٹری شپ کے دوران انہوں نے حیدری پرائمری اسکول اور حیدری ہائی اسکول پر زیادہ توجّہ دی وہ جانتے تھے بغیر تعلیم کے قوم ترقّی نہیں کرسکتی۔ ان کو قوم کی فکری تنزّلی اور قوم کی ترقّی کا شیرازہ بکھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اس لئے ان کی نظر میں قومی و دینی ترقّی ہی سے وطن کی ترقی ممکن تھی۔ جسکے لئے علم ضروری تھا جب تک وہ حیات رہے قوم کو تسبیح کے دانوں کی طرح جوڑے رکھا۔ اس کام میں انہوں نے سانکھنی سے لیکر دہلی تک بہت سے

اشخاص کا سہارا لیا۔ جو سانکھنی کے افراد دہلی میں مقیم تھے ان افراد کو علاقہ وار قوم کی، انجمن کی اور دینی درسگاہوں کی ذمّہ داریاں سونپی گئیں اور قوم کے حالات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل کمیٹیاں قائم کی گئیں جیسے کشن گنج دہلی میں الحاج منشی محمد حسنین، مرزا مونس علی، مرزا مصاحب حسین، مرزا داور حسین، مرزا محمد ثقلین، مرزا رفتار حسین، مرزا ذوالفقار علی، اور منشی مرزا ضرغام علی، گلی شاہتارا دہلی میں مرزا اکبر حسین (نوحہ خواں)۔ مرزا اعجاز حسین، ماسٹر مرزا نواب علی، منشی مرزا مہربان علی، اور کوچہ پنڈت دہلی میں بابو مرزا انوار حسین کا سہارا لیا جبکہ جمنا پار دہلی میں ماسٹر مرزا یوسف علی، ماسٹر مرزا شرافت حسین وغیرہ کو ساتھ لیکر قومی ذمّہ داریوں کو عملی جامہ پہنایا، مندرجہ بالا اشخاص کے علاوہ وطن سانکھنی میں مرزا غلام حسین قاضی انصر حسین، ماسٹر علی احمد، مرزا نذر محمد، مرزا مظاہر حسین، مرزا انصار حسین ابن مرزا انوار حسین (حال مقیم کراچی پاکستان) وغیرہ وغیرہ کو وطنی اور قومی ذمہ داریاں سپرد کیں۔ اس لئے مرزا محمد علی کے ساتھ شروع تا آخر مندرجہ بالا اشخاص کا برابر تعاون رہا۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بات لکھنے میں بھی بہت فخر محسوس ہو رہا ہے کہ مرزا محمد علی کے ساتھ حاجی آغا برکت علی اور ماسٹر عظمت علی کا بھی بہت زیادہ تعاون رہا۔

یہ سچ ہے کہ آج قوم میں مرزا محمد علی اور مرزا بابو انوار حسین وغیرہ جیسی شخصیت موجود نہیں لیکن ان کا بتایا ہوا راستہ ہمارے لئے چراغ راہ بن سکتا ہے۔ ان کی روشنی میں ہم

اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستے میں کیوں کر قدم اٹھانا چاہئے اور قدیم و جدید راہیں کہاں جا کر ملیں گی۔ انہوں نے وطن کے لئے جو بھی کام کیا اس میں خیر خواہی اور بہتری کا خیال مدّ نظر رکھا یہاں تک کہ اپنی خوشی و آرام کو بھی وطن پر قربان کر دیا۔

میں اکثر و بیشتر محسوس کرتا ہوں کہ بستی کا ہر شخص اپنی زندگی جی رہا ہے اِدھر اُدھر کون ہے؟ کون کس حال میں ہے؟ اس کا کچھ پتا نہیں! آج جبکہ ہمارے پاس بہت سے عیش و آرام کے اسباب موجود ہیں۔ ہم اسکے باوجود بھی خوش نہیں ہیں۔

یہ دیکھ کر غیر معمولی مسرّت ہوتی ہے کہ ہماری بستی ترقّی کے راستے پر گامزن ہے۔ تعلیمی اعتبار سے بھی ہم آگے بڑھ رہے ہیں لیکن دل یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی قدیم روایات کو بھی یاد رکھیں اور برقرار رکھیں اسکے لئے ہمارے اہلِ علم حضرات کی ذمہ داری ہوگی کہ نئی نسل کو سمجھائیں۔ اسکو برقرار رکھنے پر ہی ہماری نئی نسل کامیابی کی طرف بڑھ سکتی ہے۔

آج ہم میں اتحاد و اتفاق نہیں رہا۔ سماج ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے مسلم ہونے کے باوجود ہم علیحدہ علیحدہ فرقوں میں رہ کر وقت کے تقاضوں کو پہچانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ایک بے حسی سی ہم پر طاری ہے زبان پر تالے پڑ گئے ہیں۔ اہلِ علم کا قلم بھی زنجیروں میں قید ہے۔ ایسے میں بستی سے آواز اٹھنا ضروری ہے، آواز آئیگی تو لوگ ساتھ آئینگے۔ بیداری کے باوجود لیڈر شپ نہیں ہے ہم کہاں سے کہاں آ گئے بڑی عبرت کا مقام

ہے۔ہمیں مرزا محمد علی کو ایک بار پھر سے سمجھنا ہوگا اور پھر انکی تعلیمات علم وعمل کی جوت بستی اور قوم میں جلانی ہوگی تب ہی ان کے خوابوں کی تکمیل ممکن ہو سکے گی۔

سانکھنی میں تعلیم نسواں کی بہت بڑی کمی تھی وطن کی بچّیوں کو گھر کی چوکھٹ پار کرنا گناہِ متصوّر سمجھا جاتا تھا تاریخ گواہ ہے جب بھی کسی چیز کی بنیاد پڑتی ہے وہ ایک نہ ایک دن مکمل ہو کر رہتی ہے۔مرزا محمد علی کو تعلیم نسواں کی بہت زیادہ فکر تھی آخر کار لوگوں نے اپنی تنگ نظری اور دقیانوسی خیالات کو دفن کر دیا اور زمانے کے ساتھ ساتھ اپنی بچیوں کو دینی و دنیاوی تعلیم دینے پر آمادہ ہو گئے دیکھتے ہی دیکھتے آج ہماری بچیاں وطن سے دور اندرونی ملک و بیرونی ممالک میں اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے رہی ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مرزا محمد علی کا جاننے والا انکی عزت کرنے والا ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں لیکن پھر بھی انکی جوانی سے آخری دم تک میرے اور مرحوم کے درمیان بہت زیادہ محبت رہی۔ زندگی کے آخری وقت میں جب بھی کبھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا وطن کے حضرات اور تعلیمی اداروں پر ضرور گفتگو ہوئی، اُس صوم صلواۃ اور تہجّد گذار انسان کا چہرہ آج بھی میرے ذہن میں کروٹیں لیتا ہے، مجھے اس بات کا فخر ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا کرنے میں مرزا محمد علی کا بھی حصّہ ہے۔

مرزا محمد علی نے خود کو کبھی اکیلا نہیں سمجھا گھر کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وطن

کی ذمہ داریوں کا بھی پاس تھا میں نے اپنی کم عمری میں مرزا محمد علی، قاضی انصر حسین، اور مرزا غلام حسین، زمیندار مرزا کلّو بیگ، ماسٹر مرزا علی احمد وغیرہ کو مسجد عظیم بیگ سے لیکر چوک کلّن تک اپنے سروں پر وزن اٹھائے ہوئے راستے پر مٹّی کا بھراؤ کرتے ہوئے دیکھا ہے جس وقت مساجد، امام بارگاہ، اور دینی مدارس کے لئے وطن کے کسان حضرات سے سالانہ چندہ کے طور پر غلّہ کی اُگاہی کی جاتی تھی تو اپنی انجمن حیدری رجسٹرڈ کی تشکیل شدہ کمیٹی کو ساتھ لیکر گھر گھر سے غلّہ کو بوریوں میں بھر کر خود امامؑ بارگاہ میں اکٹھا کرتے تھے کیا جذبہ تھا، کیا محبّت تھی مانو آسمان سے تمام ستارے زمین پر اتر آئے ہوں زیادہ تر افراد اس دنیائے فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے ہیں اور جو چند افراد باقی بچے ہیں۔ان کو دیکھ کر وطن پرستی کی تصویر آنکھوں میں گھومتی ہے جو نئی نسل کے موجودہ دور میں نظر نہیں آتی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے خود کو اکیلا محسوس کیا لیکن ہمّت نہیں ہاری انہوں نے ہر یگانے بیگانے کو اپنے دل میں جگہ دی لیکن اس دنیائے فانی میں کون کب تک رہتا ہے ایک دن اسے اپنے حقیقی معبود کی طرف پلٹنا ہی ہوتا ہے اگر عمر نے اور وفا کی ہوتی تو وطن عزیز کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا وطن کی خدمت کرتے ہوئے یہ آفتابِ سانکھنی یکم فروری ۱۹۸۹ء کو غروب ہو گیا۔ میں ان کے حوصلے اور مسکراتے ہوئے چہرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ لوگ سوچتے رہ گئے وہ وطن کے افراد کو کڑی سزا دے کر شہرِ خموشاں میں سو گیا اب روتے

رہو، تڑپتے رہو۔

کل چمن تھا، شاخ گل تھی، تھیں بہاریں اور آج
ہم کھڑے ہیں سر جھکائے اپنا تلواروں کے بیچ

یکم فروری ۱۹۸۹ء کے بعد مرزا محمد علی مرحوم کے فرزند اصغر مرزا فردوس علی نے باپ کی وطنی تمام ذمہ داریوں کو مکمّل کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور بستی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ متعدّد بار بستی کے پردھان رہے اور ضلع کی اِکائی کے ضلع پنچایت ممبر بھی رہے۔ بستی کے پختہ گلی کوچوں اور سماج کے لئے پنچایت گھر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انجمن حیدری کے سرپرست کے علاوہ ادارے کے صدر بھی رہے اور اس وقت بھی دل و جان سے سماج کی ترقّی و فلاح و بہبودی کے لئے برابر کوشاں ہیں۔ ان کے ساتھ ہر موڑ پر اہل وطن کی محبتیں بھی شامل حال رہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر کرنا اپنا فرض عین سمجھتا ہوں کہ حیدری ہائی اسکول کو حیدری انٹر کالج بنانے میں مرزا فردوس علی کا ایک اہم کردار رہا ہے اور میں خداوند کریم کی بارگاہ میں سر بہ سجود ہو کر دعاء گو ہوں کہ جلد سے جلد یہ حیدری انٹر کالج انہیں کی زیرِ نگرانی میں ڈگری کالج کی شکل اختیار کر لے۔ آمین!

یاد رکھئے

''اگر پہاڑ کو سرکانے کا ارادہ ہے تو پہلے ذروں کو سرکانا سیکھو''

مرزا یونس علی ''قلندر''

مرزا یونس علی قلندر کی پیدائش ۱۸۸۸ء میں موضع سانکھنی ضلع بلند شہر کے ایک معزز اور زندہ دل زمیندار گھرانے میں ہوئی انہوں نے ابتدائی تعلیم پرائمری مکتب سانکھنی سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد گاندھی چوک بلند شہر میں سکونت اختیار کر لی اسی دوران تصوف کی طرف رجحان پیدا ہوا وہ اپنے وقت کے مستند صوفی بزرگ' کے پیر مرید میں شامل ہو گئے رفتہ رفتہ اپنی صوفیائے کرام میں انفرادی حیثیت قائم کر لی۔ آخر کیا بات ہے کہ جو ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی عوام الناس انہیں یاد کرتی ہے؟ اسکی وجہ ہے انکی تعلیمات جن کا مکمل رجحان تصوف کی جانب تھا نہ صرف یہ کہ انکی شخصیت سحر انگیز تھی وہ بلند شہر کی عوام کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور ہر دلعزیز تھے۔

مرزا یونس علی اپنے ان تمام اقوال، اعمال، تصوف اور روحانیت اور تعلیمات کی شکل میں آج بھی زندہ ہیں جو معاشرہ کے ہر زخم کی دوا ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا یونس علی کو غالبًا انکی زندگی میں ہی '' قلندر'' کا لقب دیا گیا جیسا کہ انکی قبر پر لگے کتبہ سے عیاں ہے یا ہوسکتا ہے کہ آپکے وصال کے بعد چشتیہ سلسلے کے مریدین نے مرزا یونس علی کے لئے اس لقب کو موزوں ترین لقب جانتے ہوئے اسے عوام میں چلا دیا۔ آہستہ آہستہ '' قلندر'' مرزا یونس علی کا دوسرا نام ہی نہیں بلکہ تمام ضلع کے صوفیائے کرام میں انکی پہچان بن گیا۔

تصوف ایک خاص پہلو تھا آپکی زندگی کا کہ جس کی وجہ سے آپ نے عوام الناس سے اپنا رشتہ براہِ راست قائم کیا، انہیں دیکھا، انہیں سُنا ان سے بات چیت کی اور ان کے دکھ درد دور کرنے کے لئے انہیں بھی تصوف و روحانیت کا سبق پڑھایا، اگر ان سے لوگوں کو محبت نہیں ہوتی تو الگ الگ مذاہب کے لوگ اتنا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی مرزا یونس علی کی قبر پر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کیوں آتے؟ میں خود اچھی طرح جانتا ہوں اور بارہا دیکھا ہے کہ محترمہ بشیر فاطمہ عرف بشیرن اپنے پیر و مرشد کے ساتھ آتی تھیں اور گھنٹوں قبر پر دھیان لگائے بیٹھی رہتی تھیں میری والدہ محترمہ نادرہ بیگم کو وہ بہت پیار کرتی تھیں اور بیٹی کہتی تھیں جسکی وجہ سے مؤلف بھی نانی جان کہہ کر مخاطب ہوتا تھا انکی شفقت آج تک آنکھوں میں گھومتی ہے، میں ان سے انکے آستانے پر بھی ملا ہوں، کالے آم بلند شہر چوراہے کے قریب ان کا آستانہ تھا اور انکے گرد و نواح میں انکے پیر مرشد کی قبریں تھیں، محترمہ بشیر فاطمہ مرزا یونس علی کا نام لیتے ہوئے بہت دہشت محسوس کرتی تھیں ان کو قلندرا اور صوفی جی کے نام سے یاد کیا کرتی تھیں۔ محترمہ بشیر فاطمہ نے بتایا کہ تصوف کا تعلق نفاست سے ہوتا ہے۔ دل اللہ کا گھر ہے یہ کائینات کی کل حقیقتوں کی عکّاسی کرتا ہے اور اسی نور سے وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تصوف روحانی تعلیم کی اس منزل کو کہتے ہیں جہاں اسرارِ خداوندی کے پرتو نظر آتے ہیں علم و عرفان کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جہاں حقیقت جلوہ نما ہے۔ تصوف دین کا وہ جز ہے جہاں روحانی احساسات پیدا ہوتے ہیں اسکے لئے اگر ضرورت ہے تو علم و عمل کی۔

اس علم کو علمِ عرفان کہتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل اس تصوف کے چار مدارج ہیں :

۱۔ شریعت

۲۔ طریقت

۳۔ معرفت

۴۔ حقیقت

۱۔ پہلا مقام احکامِ شریعت کو دیا گیا ہے جس کے مطابق انسان خود کو مکمل طور پر احکامِ الٰہی کے سپرد کرتا ہے ۔ اسمیں اسلام کے بتائے ہوئے تمام فرائض شامل ہیں یعنی صوم وصلوٰۃ ، اخلاق ، عنایات اور سبھی کچھ ، شریعت دین اسلام کا باضابطہ نظامِ حیات یا دشورالعمل ہے جس پر چلنے سے وہ مسلمان کہلانے کا مستحق ہوگا ۔ یہاں خود غرضی ، خود شناسی ، جہالت ، حسد ، بغض ، غصّہ وغیرہ سبھی نفسیاتی کمیوں اور اس قسم کی دیگر خرافاتوں کو دھو کر دل کو صاف بنانا ہوتا ہے کیونکہ نچلی خواہشات کو دبا کر ہی دل کا آئینہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ہی نورِ الٰہی جھلکتا ہے ۔

۲۔ دوسری منزل طریقت ہے ۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جس چیز کو حاصل کرنے کا ایک خاص طور طریقہ ہوتا ہے کہ جس کو اگر اختیار نہ کیا جائے تو منزل مقصود کو پانا دشوار ہوتا ہے ۔

تصوف کی منزل پر چلنے والا سالک کہلاتا ہے اور جب یہ سالک شریعت سے طریقت کے میدان میں آتا ہے تو اسے بہت سے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے پہلا توبہ کا دروازہ ہے جب تک سچے دل سے پاک ہوکر نیک نیت نہ کر لی جائے تو سالک آگے قدم نہیں بڑھا سکتا ۔

اسکے بعد دوسرا مرحلہ وِرا کا ہے جہاں ہر بُری چیز سے نفرت ہوتی ہے۔ تیسرا مرحلہ فقر ہے۔ فقیر وہ ہے جو فاقہ کرتا ہے۔ قناعت کرتا ہے اور ریاضت کرتا ہے۔ چوتھا مرحلہ صبر کا ہے صبر کا بہت اعلیٰ مقام ہے صبر سے ہر چیز حاصل ہوسکتی ہے قربِ الٰہی آسان نہیں اسکے لئے صبر ایوبؑ چاہئے اور گریۂ یعقوب۔ پانچواں مرحلہ توکّل ہے۔ یہ صبر سے ہی جڑا ہوا ہے اور اللہ پر بھروسہ اور یقین ہے جس نے ہر حال میں مالک سے دل لگائے رکھا ہو وہ صابر اور متوکل ہے۔ چھٹا مرحلہ رضا ہے سالک ہمیشہ راضی رہتا ہے۔ طریقت کے ساتھ اصولوں کو جب انسان اپنا کر آگے بڑھتا ہے تو وہ تصوف کی دوسری منزل پر پہونچ جاتا ہے۔

۳۔ تصوف کی تیسری منزل معرفت ہے یہ صحیح معنوں میں علم کا میدان ہے یہ علم ایسا ویسا علم نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایسا عرفان ہوتا ہے کہ جہاں چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں اس میں نفسِ عمارہ کو مار کر نفس لوامہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے نفسِ مطمعنّہ کو پانا ہوتا ہے اسکو سمجھنے کے لئے کئی مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ مراقبہ ہے۔ سالک کے ذکر میں ایسا دل لگا کر بیٹھ جانا کہ جہاں دل و دماغ پر کسی اور چیز کا دخل نہ ہو ٹھیک ایسے ہی جیسا کہ موتی کا متلاشی سمندر کی تہہ میں پہونچ جاتا ہے، انسان کے تمام حواسی حتیٰ کہ سانس بھی ''اللہ ھو'' کا ورد کرنے لگتے ہیں یہ سلسلہ ایک دن کا نہیں بلکہ کئی مہینوں اور برسوں کی ریاضت کا سلسلہ ہوتا ہے۔ جس کو مرزا یونس علی نے شب و روز ریاضت سے حاصل کیا تھا۔ وطن کے اشخاص بھی انہیں کوئی صوفی جی اور کوئی اللہ ہو، کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ دوسرا مرحلہ محبت ہے، محبت حسنِ حق

کی بھوک ہے۔ محبت تختی ہے توریت کی، محبت کتاب ہے انجیل کی ،محبت مصحف ہے قرآن کا ،محبت خالصیت ہے خالق کی، محبت کنجی ہے قرب الٰہی کی اور محبت جڑ ہے تخلیق کی۔ محبت نہ ہوتو انسان کیا حیوان بھی اس کرّۂ ارض پر وجود میں نہ آتے۔ اور نہ انکی پرورش ہوتی۔ جہاں محبت ہے وہاں خدا ہے۔ تبھی کہا جاتا ہے کہ عشقِ الٰہی عرفان کا سرچشمہ ہے۔ سالک کے لئے اگلا مرحلہ خوف ہے۔ خوف الٰہی نہ ہوتو نفسانی خواہشات اصل مقصد سے اسے دور کر دیتی ہیں خوف خدا اسے راستے سے بھٹکنے نہیں دیتا، جو خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

اس کے بعد مرحلہ امید کا ہے۔ بشر کی زندگی امید سے وابستہ ہوتی ہے اگر دل میں خوفِ خدا کے ساتھ یادالٰہی و عشق باری تعالیٰ ہوتو امید کی کرن خوب نکھرتی ہے اور سالک اپنی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ اسکے بعد باری آتی ہے شوق کی جو مقناطیس کی طرح حق کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے۔ اگلا مقام قرب ہے، سالک اپنی مسافت طے کرتا جاتا ہے اور اللہ کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر اُنس کا مقام آتا ہے۔ اُنس، الفت، محبت اور عشق وغیرہ وہ پاک جذبے ہیں جن سے تمام کثافت دور ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد باری ہے اطمینان کی۔ انسانی ذہن کے لئے اطمینان ایک نعمت ہے جو کہ کچھ اسی طرح کی کیفیت ہوتی ہے کہ ذہین طالب علم امتحان دے چکنے کے بعد سو فیصد نمبر پانے کی امید رکھتا ہو، اسکے بعد جو منزل آتی ہے اسے مشاہدہ کہتے ہیں، جو مہینوں کی تلاش کے بعد منزل مقصود کے ساحل کا پتہ لگا لیتا ہے اسکے بعد کی منزل یقین کی ہے اس میں کامیابی کا راز ہے یہیں پر قطعئی طور پر معلوم ہو جاتا ہے

کہ دعا مقبول و قبول ہوئی۔

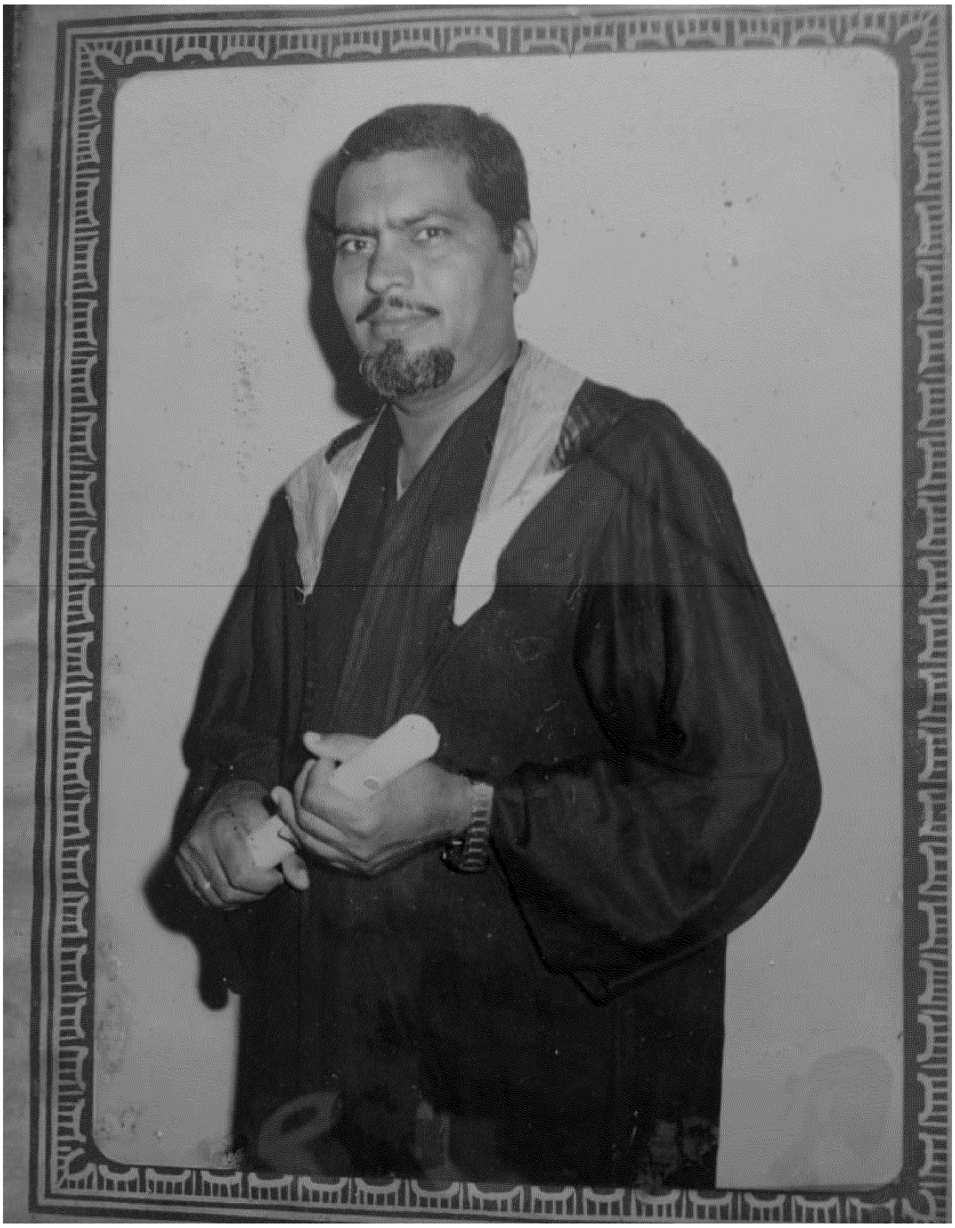
۴۔ پھر آخری منزل حقیقت کی ہوتی ہے جو کہ منزل مقصود ہے اور جہاں جلوہ خداوندی کا سیلاب امنڈ آتا ہے، خالق و بندے کا ملاپ ہوتا ہے روحانیت کی معراج حاصل ہوتی ہے اور تخلیق کا مقصد پورا ہوتا ہے یہ فنا کا مقام ہے، یہاں مادیت کا آخری قطرہ روحانیت میں تبدیل ہو جاتا ہے جسدِ خاکی سے نکل کر صوفی روح حقیقت میں ضم ہو جاتی ہے۔

محترمہ بشیر فاطمہ نے بتایا کہ صوفی و قلندر مرزا یونس علی نے شریعت، طریقت، معرفت، اور حقیقت کو بہت ریاضت کے ساتھ حاصل کیا تھا ویسے وہ گاندھی چوک (بلند شہر) میں ایک ٹیلر کا کام کرتے تھے۔ ٹیلرنگ کی دنیا میں بھی ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی انگریزی افسران کا ان کے آستانے پر تانتا بندھا رہتا تھا۔ کچھ کند ذہن افراد انہیں صرف ٹیلر کے نام ہی سے جانتے ہیں۔

مرزا یونس علی قلندر کے بعد انکے بڑے بیٹے مرزا مونس علی (صوفی جی) نے اس راہ پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس منزل کو نہیں پہونچ سکے۔ مرزا مونس علی (صوفی جی) کے بعد انکے بڑے بیٹے مرزا یوسف علی نے بھی اس راہ پر چلنے کی بہت کوشش کی اور خود کو خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے وابستہ کر لیا لیکن منزل مقصود نہیں پا سکے۔

یاد رکھئے

''یادیں حنا کی مانند ہوتی ہیں جو سوکھ جانے کے بعد رنگ لاتی ہیں''



ماسٹر مرزا یوسف علی ابن مرزا مونس علی مرحوم

ماسٹر مرزا یوسف علی ابن مرزا مونس علی مرحوم

ماسٹر مرزا یوسف علی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں آپ کی پیدائش ۲؍جنوری ۱۹۵۰ء کو اتر پردیش کے قصبہ سانکھنی میں ایک عزت دار گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والدِ ماجد کا نام مرزا مونس علی تھا اور دادا کا نام مرزا یونس علی 'قلندر' تھا جو کہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ ماسٹر مرزا یوسف علی بچپن ہی میں دہلی آ گئے اور ابتدائی تعلیم پرانی دہلی کے کوچہ پنڈت پرائمری اسکول سے حاصل کی۔ چھٹی جماعت سے گیارہویں جماعت تک اینگلو عربک ہائر سکینڈری اسکول اجمیری گیٹ کے طالب علم رہے۔ بعد ازیں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے امتیازی نمبروں کے ساتھ بی۔ ایس۔سی کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہی ۱۹۷۱ء میں بی۔ ایڈ کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۹؍ستمبر ۱۹۷۲ء کو بطور ٹی۔ جی۔ ٹی سائنس گورنمنٹ بوائز سکینڈری اسکول پٹودی ہاؤس میں تدریسی خدمات دینے کا موقعہ ملا۔ دورانِ ملازمت (۱۹۸۱ء) آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اکنامکس سے ایم۔ اے کیا اور یہاں پر ہی اکنامکس کے لکچرر ہوئے۔ اپنی ۴۰ سالہ بیداغ تدریسی خدمات کی تکمیل کے بعد مرزا یوسف علی ۳۰؍جنوری ۲۰۱۰ء کو گورنمنٹ بوائز سکینڈری اسکول پٹودی ہاؤس' دریا گنج سے سبکدوش ہو کر نارتھ گونڈا، دہلی میں عزت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں ایران، عراق اور سیریا کی زیارات سے فیض یاب ہوئے۔ دوسری بار ۱۹۹۹ء میں حج وزیارات سے فیض یاب ہوئے۔

دورانِ سروس قوم کی فلاح و بہبودی کے لیے جو کام مرزا یوسف علی نے انجام دئے ان کو سانکھنی کی سرزمین پر کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دہلی میں رہ کر وطن کے ساتھ قومی ہمدردی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بیرونِ سانکھنی میں بھی بہت سے کام سرانجام دیے۔اس کے علاوہ انجمن حیدری رجسٹرڈ شاہِ مرداں' امامیہ ہال پچکوئیاں روڈ، دہلی رکن کی حیثیت سے بھی کام کو بخوبی انجام دیا۔اوران جگہوں پر قوم کے افراد کو ساتھ لے کر جو باہری مسلم و غیر مسلم حضرات کا قبضہ کیا ہوا تھا ان جگہوں کو ان کے شکنجے سے آزاد کرایا۔درگاہ پنجہ شریف، دہلی کی مختلف پوسٹ پر فائض رہتے ہوئے اپنے بچپن کے دوست حاجی شاکر حسین انصاری شکار پوری کشن گنج، دہلی (شیشے والے)اوراپنے وطن سانکھنی کے تمام افراد کو ساتھ لے کر درگاہ پنجہ شریف کو آزاد کرایا۔درگاہ پنجہ شریف کی نئی تعمیر میں ایک اہم کردار نبایا۔اس کے ساتھ ساتھ انھیں سب سے زیادہ خوشی اپنے وطن کی ترقی کی تھی۔مرزا یوسف علی انجمن حیدری رجسٹرڈ سانکھنی اورانجمن حیدری کی دہلی برانچ سے بھی کافی عرصہ تک وابستہ رہے۔ایک مدّت تک حیدری انٹر کالج سانکھنی کے منیجر رہے ان کے ساتھ مرزا مظاہر حسین مرحوم حیدری انٹر کالج سانکھنی کے خازن کی حیثیت سے مرزا محمد علی مرحوم کے ساتھ مل کر قوم کے اندر علم کی جوت جگا رہے تھے۔آج ایسی ہی ایک نئی نسل کی ضرورت ہے۔جو سانکھنی کو ترقی کی راہ پر لے جاسکے۔

مرزا یوسف علی نے غریب الوطن حضرات کی تعلیم کے سلسلے میں بیرونِ سانکھنی پڑھنے والے سانکھنی کے طلباء کو خود مالی امداد فراہم کیں اوران کی سرکاری/غیر سرکاری ملازمت میں بھی بھرپور کوشش کی۔فی الحال مدرسہ اہلِ بیت مصطفےٰ آباد، دہلی کے فاؤنڈر کی حیثیت سے کام کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔پھوپی زاد بھائی ہونے کے ناطے میرا اوران کا بہت ساتھ رہا ہے۔جب

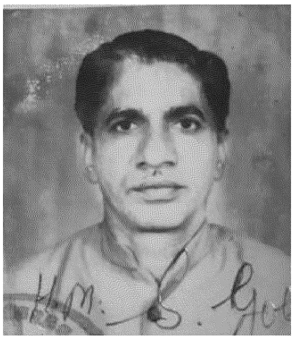
بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مجھ سے ملنے آتے، وطنی ترقی کا ذکر ضرور کرتے۔ ان کی زبان پر دو انگریزی محاورے (History repeats itself, and all that glitters is not gold) بار بار آتے اور اس پر عمل کرنے کی بار بار مجھ کو بھی تاکید کرتے۔ وہ وطن کے اندر علم کی ترقی اور قومی جذبہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اکثر رات کو ہم دونوں میں جب بحث کا موضوع چھڑ جاتا تو یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ کب آسمان پر ستاروں کا جمگھٹ نمودار ہوا اور کب غروب ہو گیا۔ قوم کی ترقی کے لیے سر سید احمد خاں، فاؤنڈر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے گھر کی ہر ایک چیز کو قوم پر نچھاور کر دیا۔ ان کو طرح طرح کے خطابات سے نوازہ گیا لیکن انھوں نے قوم کو ترقی پر لانے کے لیے جن دشواریوں کا سامنا کیا وہ آج پوری دنیا پر عیاں ہیں۔ وطن کے حضرات کو ان کے نقشِ قدم پر اپنے وطن کی ترقی کے لیے تمام اہلِ وطن کو ساتھ لے کر ہمیں بھی کوشش کرنی ہوگی۔ آیئے ہم آپ سب کو مل کر ان تمام حضرات کے قومی جذبات کی قدر کرتے ہوئے ان کے خیالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، اس دور کے معزز حضرات کے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے اور ان حضرات کی یاد میں بانئ انجمن جناب مرزا داور حسین (بلّو خاندان) حال مقیم کراچی اور جناب مرزا اکبر حسین (ہنّی خاندان) لاڑ کانہ سندھ (حال مقیم کراچی) اور بہت سے معزز حضرات نے جو سانکھنی کے اداروں کو اپنے خون سے سینچنے کی کوشش کی ہے ان کی یاد زندہ رکھنے کے لیے ہر سال ایک سالانہ جشن کا اہتمام بھی نئی نسل کے ذریعہ کیا جا سکے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا سے انسانیت تب رخصت ہوتی ہے جب انسان اپنے انسان ہونے کے وقار اور معیار کو کھو دیتا ہے۔ آج ہم گفتار کے غازی رہے اور نہ ہی کردار کے اس لیے ہمارا جوش اور جذبہ بھی ناپائیدار ہے اس کے لیے بزرگ حضرات کی دعاؤں کے ساتھ وطن کے

نوجوان طبقہ کو سامنے آنا ہوگا۔ ہم تو ڈوبتے ہوئے سورج ہیں نہ جانے کب غروب ہو جائیں۔ جو کچھ بھی وطن میں اب تک نااتفاقیوں کا عروج ہوا اس کو دل سے بھلانا ہوگا۔

ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی، قومی ترقی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثرِ بد پہنچایا ہے۔ بس ہماری قومی ترقی کا سب سے اوّل مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یکجہتی سے مبدل کریں۔ اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے، عقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی اور اچھائی کا خیال نہیں ہے بہت سے نیک اور اچھے کام ان سے ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی عالیشان مسجدیں، کیسی کیسی عالیشان امام بارگاہیں ہیں جو لوگ اس دنیا سے کوچ کر گئے ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں۔ اب بھی قصبہ میں دیکھو گے کہ لوگ کس قدر خیرات کرتے ہیں بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، حج و زیارات کے لیے دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ مسجدیں بنواتے ہیں جس میں ان کی دانشت میں مذہبی نیکی ہو دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں جو بھی کام کیا جاتا ہے روزِ حشر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور دل میں تمنا رہتی ہے کہ اس کا روزِ حشر ان کو ثواب حاصل ہوگا۔ اگر یہ میرا خیال صحیح ہے تو درحقیقت یہ سب کام خودغرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں نہ کہ قومی ہمدردی کے۔ جب تک ہمارے دل میں یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں وہ قوم کے لیے کریں نہ کہ اپنے ثوابِ آخرت کے لیے، اس وقت تک قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہیں ہوسکتا۔ ان تاریخی عمارتوں کے قصبہ میں بہت سے تناور درخت تھے جو کہ آخری دم تک تیز و تند ہواؤں کا مقابلہ کرتے رہے آخر وہ بھی پیوندِ زمیں ہو گئے۔



ماسٹر مرزا نواب علی ابن مرزا نعمت اللہ

ماسٹر مرزا نواب علی کے بارے میں لکھنا میرے لیے بہت دشوار کن مرحلہ ہے۔ان پر قلم اٹھانا میرے لیے چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میں اس قابل تو نہیں کہ اس بارِگراں کا متحمل ہوسکوں لیکن کوئی وجہ ایسی بھی نہیں کہ میں اپنے کو اس کا اہل نہ سمجھوں بہر حال کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

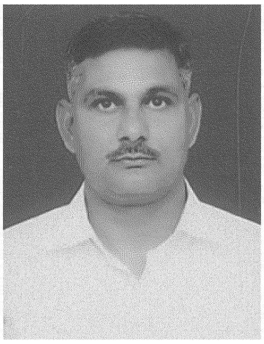
ماسٹر مرزا نواب علی کی پیدائش یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو موضع سانکھنی ضلع بلند شہر کے ایک عزت دار زمیندار گھرانے میں ہوئی ان کے پدر بزرگوار کا نام الحاج مرزا نعمت اللہ تھا جو نہایت ملنسار اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ماسٹر مرزا نواب علی نے ابتدائی تعلیم مکتب سانکھنی سے حاصل کی اور درجہ آٹھ ٹاؤن اسکول جہانگیر آباد سے جبکہ ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ شکھشا سدن انٹر کالج جٹپورہ سانکھنی سے کیا۔اس کے بعد بی ٹی سی سرٹیفکیٹ دادری سے حاصل کیا۔تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ۱۸ر ستمبر ۱۹۶۳ء کو دہلی میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔اس سے قبل جٹپورہ انٹر کالج میں بھی بحیثیت انگریزی ٹیچر کی تقرری ہوئی۔تہذیب وتمدن، آدابِ طبیعت

کو دیکھتے ہوئے مستعفیٰ ہوکر اپنی پسندیدہ جگہ دہلی کو ترجیح دی۔ ماضی کی جانب مڑ کر دیکھنا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ دہلی میں تقرری ہو جانے کے بعد گلی شاہ تارا اجمیری گیٹ کو اپنا مسکن بنایا۔ رفتہ رفتہ دہلی کے ماحول کو سمجھا اور اسکولوں میں اساتذہ کی سیاست کو قریب سے جانا دہلی ٹیچرس ایسوسیئیشن کے نائب صدر بھی رہے۔ ماسٹر مرزا نواب علی اپنی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز سے گزرے مگر انہوں نے دامن ہمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دہلی کی سیاست کو جاننے اور سمجھنے کے بعد قوم کے درد کو بھی محسوس کیا۔ وطنِ عزیز کا کوئی بھی کام ہو شب وروز دل وجان سے تیار رہتے۔ متعدد دفعہ انجمن حیدری رجسٹرڈ دہلی برانچ کے صدر، جنرل سکریٹری وغیرہ رہے۔ وطن کی اہم ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے امام بارگاہ، مساجد اور اسکول کی تعمیر میں ہمیشہ ان کا نام سنہری الفاظ میں لکھا جائیگا۔

اپنی زندگی کے ہر دور میں ماسٹر مرزا نواب علی مقبول رہے ہیں۔ ان کی پسندیدگی اور مقبولیت کے متعدد اسباب نظر آتے ہیں۔ اگر رہبر قوم وملت کے زاویہ سے دیکھیں تو انھوں نے ایک ایسے محبّ وطن کا نمونہ پیش کیا جو وطن کی آزادی اور خوشحالی کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر دیتا ہے۔ اور بدلے میں صرف اہلِ وطن کے لیے امن وسکون چاہتا ہے۔ ایک اچھا معلم ہونے کے ناطے ہر نہج پر آزادی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ منصفانہ اور محققانہ طرز عمل اختیار کیا وہ اپنی نجی اور گھریلو زندگی میں ایک سچے معلم تھے۔ لوگوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں ان کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ صفِ اوّل کے معلم ہونے کے ساتھ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے انسان بھی تھے۔ وہ تمام عمر اعلیٰ علمی سرگرمیوں سے وابستہ رہے۔ جو خاندانی روایات، ممتاز علمی وتہذیبی شخصیتوں کی رفاقت اور پاکیزہ وصحت مند ماحول کا نتیجہ تھا جو ان کو

والدین سے وراثت میں ملا تھا۔

ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ جٹپورہ انٹر کالج کی نوکری سے مستعفیٰ ہونے کے بعد مرزا خاندان کی چشم و چراغ اور تہذیب وتمدن کی پیکر محترمہ تطہیر فاطمہ سے شادی کی۔ چمپئی رنگ اور غزالہ نگاہوں کی ملکہ، بہت نیک سیرت خاتون تھیں، جب بھی کسی جانب مخاطب ہوتیں تو ان کے لب ولہجہ سے شیرینی ٹپکتی تھی۔ مرزا نواب علی اپنی اہلیہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ زندگی کے آخری لمحات میں خود کو گوشہ نشین کرلیا تھا۔ بیگم صاحبہ جنہوں نے تا زندگی ساتھ نبا ہنے کا عہد کیا تھا وہ اپنے معبودِ حقیقی کی طرف لوٹ چکی تھیں۔ مرزا نواب علی ان کی جدائی کا غم برداشت نہیں کر پارہے تھے آخر کار جس مٹی سے پیدا ہوئے تھے اسی مٹی کو ۳۰ رنومبر ۲۰۱۱ء کو اپنا مسکن بنالیا۔ اب رہ گئے ہیں سر بریدہ لوگ اور چلتے پھرتے سائے اور ان سے کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔



مرزا ناظر حسین ابن مرزا مظاہر حسین مرحوم

اِسی طرح میرے ذہن میں ایک نام مرزا ناظر حسین ابن مرزا مظاہر حسین مرحوم کا سامنے آتا ہے، جنہوں نے خدمت خلق کو اپنا مقدر سمجھا۔ اپنے چچا مرزا غلام حسن اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار جناب سید انور علی زیدی صاحب کی مہربانیوں کے باعث علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہرلال نہرو میڈیکل کالج میں ستمبر ۲۰۰۸ء کو تقرر ہوا جو کہ آج کل میڈیکل کالج کی لیب نمبر ا میں اپنی ڈیوٹی کے فرائض کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ اپنے وطن سانکھنی سے آنے والے حضرات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اہلِ وطن، مقامی اور غیر مقامی جو بھی مریض حضرات ان کے پاس آتے ہیں شب و روز ان کی خدمت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وقت پڑنے پر متعدد دفعہ اپنے خون کا عطیہ بھی دے چکے ہیں اس کے لیے وہ خود کو بہت خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ اہلِ وطن سے ہمدردی کا جذبہ ان کے اندر کروٹیں لیتا ہے۔ جس سے وہ ہر دلعزیز نظر آتے ہیں۔ رب العزّت سے دعاء گو ہوں کہ ان کا یہ جذبہ قوم کے لیے ہمیشہ برقرار رہے۔

مرزا علی رضا ابن محمد کاظم

محاورہ ہے کہ ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے'' اسی محاورہ کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اپنے سماج سے جڑے نوجوان طبقے کی پریشانیوں کا خیال آتا ہے۔ جنہیں اپنے داخلہ اور اس سے متعلق پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی انسان بغیر کسی مفاد کے پردیس میں آپ کے کام آجائے تو اس کا ممنون ہونا چاہیے اور اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ میرے ذہن میں ایسا ہی ایک نام مرزا علی رضا ابن محمد کاظم عرف بلاّ مقدم کا سامنے آتا ہے۔ جو کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک سکیورٹی آفیسر ہیں۔ اہلِ سانکھنی کے لیے خود کو ہر وقت حاضر خدمت سمجھتے ہیں ان کا اپنا خیال ہے کہ ؎

مری زندگی یہی ہے کہ ہر ایک کو فیض پہنچے
میں چراغِ راہ گزر ہوں مجھے شوق سے جلاؤ

مرزا علی رضا کی پیدائش قصبہ سانکھنی میں ایک کسان فیملی میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے وطن سے حاصل کی۔ اس کے بعد ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ قصبہ جہانگیرآباد سے کیا۔ گھر کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے بہنوئی محترم مرزا انوار حسین عرف منجھلے بھائی کی مہربانیوں کے سبب دہلی میں سکونت اختیار کی۔ طرح طرح کے حالات سے گزرنا پڑا لیکن ہمت نہیں ہاری۔ کافی جدوجہد کے باعث جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پراکٹر آفس میں تقرری پائی۔ جس کے سبب انھوں نے اپنے بھائیوں، بچوں، اور بھانجوں اور بھانجیوں کو ایک اچھی تعلیم دلانے میں اہم رول ادا کیا۔ اس اہم کردار کو نبھانے کے لیے سانکھنی کی تاریخ میں ان کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔



شباب جاتا رہا اور مجھے خبر نہ ہوئی
اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں کمر جھکائے ہوئے

یادِ ماضی

جب کبھی بچپن کی یادیں آتی ہیں تو انھیں یادوں میں کھو جانے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گزرا زمانہ واپس نہیں آتا۔ گاندھی چوک بلند شہر میں اپنے نانا مرزا یونس علی قلندر کی آغوش میں پرورش پانے کے بعد ۵؍سال کی عمر میں وطنِ عزیز سانکھنی میں قدم رکھا۔ جو کہ میری جائے پیدائش تھی جہاں تک ذہن میں آتا ہے اپنے برادرِ عزیز مرزا مظاہر حسین مرحوم کے ہمراہ اسکول جانا شروع کیا۔ اُس وقت جو حیدری بازار کے درمیان میں پنچایت گھر میں اسکول تھا ''پنچ گھر اسکول'' کے نام سے مشہور و معروف تھا۔ (جو آج کل ماسٹر علی رضا و ماسٹر حسن رضا کی رہائش گاہ میں تبدیل ہو چکا ہے)۔ جب تک میرا داخلہ مستقل طور پر اسکول میں نہیں ہوا تھا۔ میرا اندراج درجہ اوّل میں پرائمری اسکول (جو کہ اب حیدری انٹر کالج ہے) میں ہوا جہاں درجہ چہارم تک پڑھائی کا شرف حاصل ہوا۔ میرے اساتذہ میں منشی مرزا مشیت علی، منشی مرزا ظہیر حسین اور

مرزا ممتاز علی تھے۔منشی مرزا مشیت علی بہت سخت مزاج انسان تھے۔ جب کہ منشی مرزا ظہیر حسین کے مزاج میں بہت نرمی تھی۔اس وقت اسکول کی عمارت کے بیچ میں ہیڈ مدرس صاحب کا کمرہ ہوا کرتا تھا اور ہماری کلاس کمرے میں اور کبھی اسکول کے صحن میں ہوا کرتی تھی۔ وقفہ ہونے کے درمیان ساتھیوں کے ساتھ ایک دوسرے کا آنکھ مچولی کھیلنا روز کا معمول بن گیا تھا۔ساتھیوں میں مرزا ریاضت حسین، مرزا اسد علی، مرزا شمشاد علی عرف بابو مرزا علی محمد، مرزا غلام حسین، مرزا شہادت علی اور محترمہ رفعت فاطمہ وغیرہ ایک دوسرے سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔

درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد اسکول سے پرائمری کلاسز کونز دمحمود گڑھی پرائمری اسکول میں منتقل کر دیا گیا تھا۔اس عمارت کو اسکول کے لیے سیٹھ پنہّ لال نے عطیہ کیا تھا۔وہاں ہمارے ہیڈ مدرس مرزا یونس بیگ مرحوم تھے جو کہ نہایت شریف انسان وصوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔کچھ طلبہ سے مساجد میں اذان دینا، مساجد کے کنوؤں کی صفائی کرانا ان کا روز کا معمول تھا۔تمام طلباء سے بہت زیادہ محبت سے پیش آتے تھے۔ ہمارا درجہ پنجم سالانہ بورڈ کا امتحان قریب کے گاؤں کھدانہ میں ہوا تھا۔جس دن ہمارا آخری امتحان تکلی رانی کے ذریعے سوت کاتنے کا ہوا اُسی وقت تیز آندھی اور ژالہ باری شروع ہوگئی۔ اسکول کی چھت جو ٹین سے ڈھکی ہوئی تھی ایک خوفناک سی آواز پیدا کرتی تھی دل دہل جاتا تھا۔تیز آندھی کی وجہ سے روئی کا گالہ اور تکلی رانی کہاں غائب ہوئے کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا۔اللہ اللہ کر کے امتحان ختم ہوا اور اساتذہ کے ہمراہ اپنے گاؤں سانکھنی چلنے کا ارادہ کیا۔ راستے میں دیکھا کہ ادھر ادھر باغات میں بہت سے درخت اکھڑے پڑے تھے۔گاؤں کے آس پاس بہت نقصان ہوا۔گاؤں کے قریب جو نیم ندی ہو کر گزرتی ہے جس کو چھوئیاندی بھی کہا جاتا ہے۔گاؤں کھدانہ سے سانکھنی آنے کا ایک وہ ہی راستہ

تھا۔ بارش کی وجہ سے نیم ندی کا پانی بھی اپنی اچھال پر تھا۔ پانی کی وجہ سے راستہ چلنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔ پریشانی کا عالم تھا وہ دن آج تک یاد آتا ہے۔ گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو چلی تھی۔ سانکھنی آکر مرزا یونس بیگ صاحب نے سیدھے مسجد عظیم بیگ آکر دو رکعت نماز شکرادا کی اور سب طلباء کو بھی اس کے لیے تاکید کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد گھر میں قدم رکھا تو تیز آندھی کے سبب جو گھر کے احاطے میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا زمین بوس ہو چکا تھا۔ جس سے گھر کی رونق ہی جاتی رہی جب سے آج تک کوئی گھر کے احاطے میں ایسا سایہ دار درخت نہیں جو تھکی ہوئی زندگی کو سکون میسر کر سکے۔

بعد ازیں چھٹی کلاس میں داخلہ حیدری جونیئر ہائی اسکول میں ہوا، کچھ ساتھی درجہ پنجم سے ہی چھوٹ گئے۔ یا یوں کہوں کہ قسمت ساتھ نہ دے سکی۔ بہت سے اساتذہ سے واسطہ رہا جو کہ اب یاد بھی نہیں ہے۔ ماسٹر ممتاز علی صاحب انگریزی کے استاد تھے ماسٹر فقیر محمد ریاضی کے استاد تھے، اس کے علاوہ ماسٹر رام ویر شرما پنڈت جی ہندی اور سنسکرت پڑھاتے تھے، ایک قابل انسان تھے جو ابھی بھی حیات ہیں۔ جب کبھی ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے بہت محبت دیتے ہیں، خوشی ہوتی ہے۔ جناب سردار خاں پٹھان ہیڈ مدرس کے فرائض کو بخوبی انجام دے رہے تھے، ان کے مضمون جغرافیہ، تاریخ اور سیاسیات تھے۔ چھٹی ساتویں اور آٹھویں کا وقت کیسے گزر گیا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ اسکول سے مشرق کی جانب شیخ ظہیر حسین کا گھر تھا، مغربی کنارے پر حاجی مرزا ریاست حسین وحاجی مرزا آدم حسین کی حویلی تھی، جو ابھی تک باقی ہے۔ شمال کی جانب بہت وسیع کھیل کا میدان تھا، شام کو اکثر باسکٹ بال، وولی بال دیکھنے کا موقعہ ملتا تھا، جہاں برادرِ عزیز مرزا مظاہر حسین کے ساتھی مرزا دلاور حسین، مرزا علی اختر وغیرہ کھیل کا مظاہرہ کرتے تھے اور کپتانی

کے فرائض شری گرراج سنگھ ادا کیا کرتے تھے۔ بارش کے موسم میں اسکول جانے کے لیے ایک ایک دو دو فٹ پانی سے گزرنا پڑتا تھا۔ شیخ ظہیر حسین کی جانب ایک بہت گہرا تالاب تھا جو کہ اب حیدری پبلک اسکول کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

نویں اور دسویں کا زمانہ بہت خوبصورت گزرا اچھے ساتھی ملے جیسے راج پال سنگھ وراجندر سنگھ (لچھوئی) پنڈت راجندر شرما (چرورا) چودھری برہم پال سنگھ ومہاویر سنگھ وغیرہ (ڈونگرا جاٹ) محمد سلیم (جلیل پور) شری کلوا سنگھ، مرزا غلام حسین، مرزا وصی حیدر، مرزا انور علی، شیخ شمس الحسن، شیخ علی حیدر، شیخ شیر علی، شیخ ناطق عباس، مرزا امجد علی، مرزا کلب حسن، مرزا آباد حسین وغیرہ وغیرہ، زیادہ تر ساتھی معلم ہیں اور بہت سے ساتھی افواج میں دیش کا سہارا بنے دو تین ساتھی ایسے گزرے جو کامیاب نہ ہو سکے اور اپنی گھریلو پریشانیوں کے سبب پڑھائی جاری نہ رکھ سکے، جیسے مرزا غلام حسین اور شری کلوا سنگھ وغیرہ لیکن جب بھی ملتے ہیں بہت خلوص سے ملتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ شری کلوا سنگھ کے یہاں متعدد دفعہ چائے پینے کا موقعہ ملا ہے ان کی اہلیہ میں بے پناہ محبت کا جذبہ دیکھنے کو ملا۔ خدا سے دعاء گو ہوں کہ وہ ہمیشہ اھل وعیال کے ساتھ خوش رہیں۔

ماسٹر مرزا یوسف علی اسکول کے صدر تھے مرزا محمد علی مرحوم جنرل سیکریٹری اور مرزا مظاہر حسین مرحوم اسکول کے خازن تھے۔ انھوں نے انجمن واسکول انتظامیہ کو ساتھ لے کر ہائی اسکول ہونے کے لئے بہت جد وجہد کی اور کامیاب ہوئے، بزرگانِ سانکھنی کی دعائیں بھی ساتھ تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اکتوبر ۱۹۷۴ء کو جونیئر ہائی اسکول کو آرٹس مضمون کے ساتھ ہائی اسکول کی منظوری مل گئی۔ سانکھنی کے زیادہ تر طلباء کو سانکھنی ہائی اسکول میں ہی داخلہ دیا گیا۔ جو والدین سائنس کے مضمون چاہتے تھے انہوں نے اپنے بچوں کا داخلہ دیگر جگہ پر دلا دیا تھا۔ اس کے بعد

اسکول مینیجنگ کمیٹی کی جانب سے ہائی اسکول کا نام حیدری ہائر سکنڈری اسکول میں تبدیل کرنے کا مطالبہ حکومت اتر پردیش سے کیا گیا جس کو مارچ ۱۹۷۶ء میں تسلیم کرلیا گیا کیوں کہ یہ ایک اقلیتی ادارہ بھی تھا جس کی منظوری بھی حکومت اتر پردیش نے اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دے دی تھی۔

ہائی اسکول ہونے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ٹیچرس حضرات کی تقرری کا تھا۔ آہستہ آہستہ مندرجہ ذیل اساتذہ کا تقرر عمل میں آیا۔

۱۔ جناب کنور شکیل احمد خاں صاحب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)
۲۔ جناب سید افتخار احمد صاحب (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)
۳۔ شری شریش چندر صاحب (جہانگیر آباد)
۴۔ جناب سید حسین عباس صاحب (شکار پور)
۵۔ شری ناگر صاحب وغیرہ (جہانگیر آباد)

مرزا یوسف علی صاحب جو کہ خود جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم رہ چکے تھے، انہوں نے جناب سید افتخار احمد صاحب کا تقرر کیا۔ (سید افتخار احمد، نیّر صاحب کے داماد تھے جو کہ بچوں کے شاعر کہلاتے ہیں)۔ ان کی رہائش کا انتظام بھی اسکول کے جنوبی کمرے میں کیا گیا تھا۔ مرزا یوسف علی صاحب جو کہ میرے حقیقی ماموں زاد بھائی ہیں انہوں نے سید افتخار احمد صاحب کے اکیلے ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ میرا سونے کا انتظام کیا۔ رات کو چوکیدار مرزا بختاور حسین بھی رہا کرتے تھے جو نماز روزہ کے پابند تھے اور تمام طلباء سے محبت سے پیش آتے تھے۔ جب کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے بعد میں معلوم ہوا ان کی جگہ ان کے بیٹے کا تقرر کر دیا گیا تھا۔

''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا'' جب میری رہائش سید افتخار احمد صاحب

کے ساتھ ہوئی تو میرے ساتھ مرزا غلام حسین، مرزا انور علی بھی رات کو قیام کرنے لگے۔ سید افتخار احمد رات کے کھانے سے فارغ ہوکر ہم سبھی کو درس کے لیے تاکید کرتے اور خود بھی سمجھاتے اس کو دیکھتے ہوئے اور بہت سے طلباء کی رات کو تعداد بڑھنے لگی۔ سید افتخار احمد صاحب نے کبھی کسی طالب علم سے کوئی پیسہ نہیں لیا۔ ایک اچھے انسان میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے وہ سب خوبیاں ان کے اندر موجود تھیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اہلِ وطن ان کو 'سید صاحب' کے نام سے جانتے ہیں۔ متعدد دفعہ ان کے دولت کدہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ تمام شاگردوں کا نام لے کر ان کی اور وطن کی خیریت معلوم کرتے اور ان کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی زبانِ مبارک پر یہ شعر بار بار آتا ہے ؎

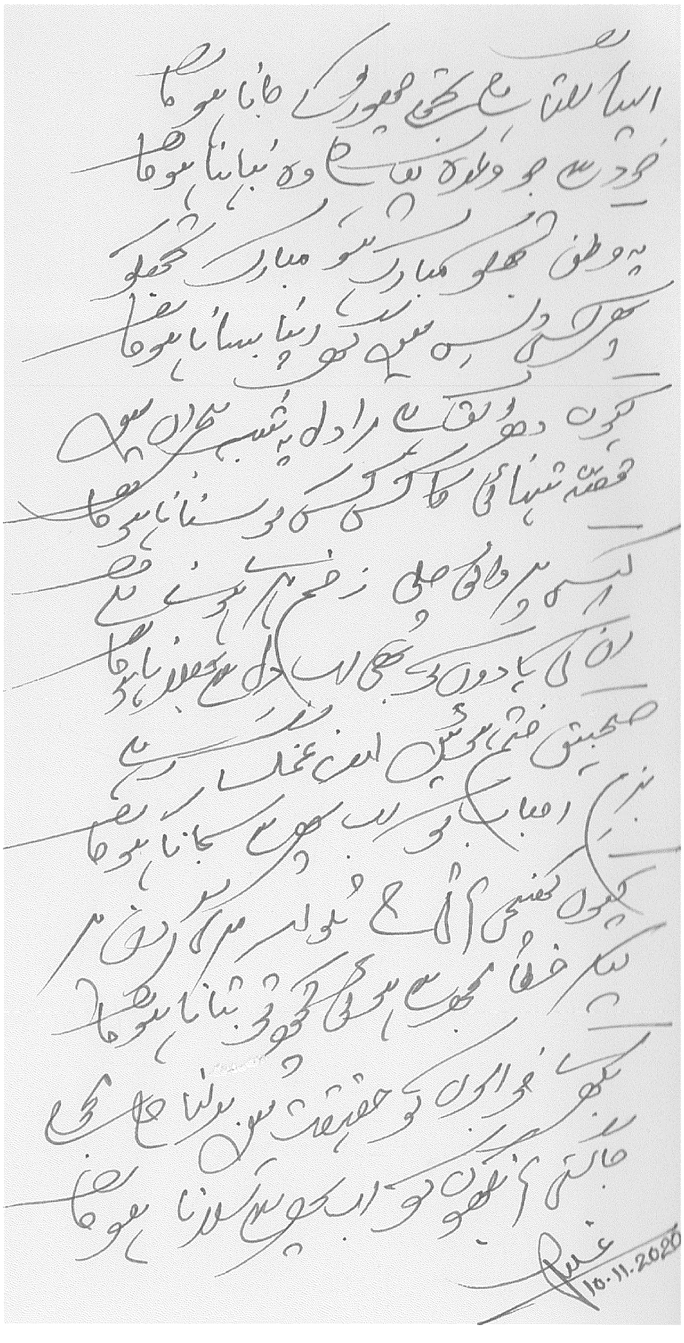
نفس کی آمد و شد ہے اجل کے پہرے میں
تم ایسے وقت میں آئے کہ کچھ کہا نہ گیا

صبح کو جلد اٹھنا روز کا معمول بن گیا تھا، اگر کبھی دیر ہو جاتی تو اسکول صفائی کرم چاری شریمتی جاوتری دیوی بلا ناغہ صبح میں آتی تھیں 'کسان سلام' صاحب سلام' کہہ کر مخاطب ہوتیں 'بزرگ خاتون تھیں رنگ سانولا درمیانہ قد چہرے پر مسکراہٹ' ایک وفا کی دیوی لگتی تھیں۔ بہت سے ساتھیوں کے چہرے جو آنکھوں سے اوجھل ہو گئے یاد کرنے کے بعد بھی یاد نہیں آتے۔

جناب سردار خاں 'پٹھان' پرنسپل، کا رٹائیرمنٹ ہوا اور کنور شکیل احمد خاں صاحب کو پرنسپل بنایا گیا۔ سید افتخار احمد صاحب کا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہو گیا۔ ہائی اسکول کے بعد ۱۹۷۷ء

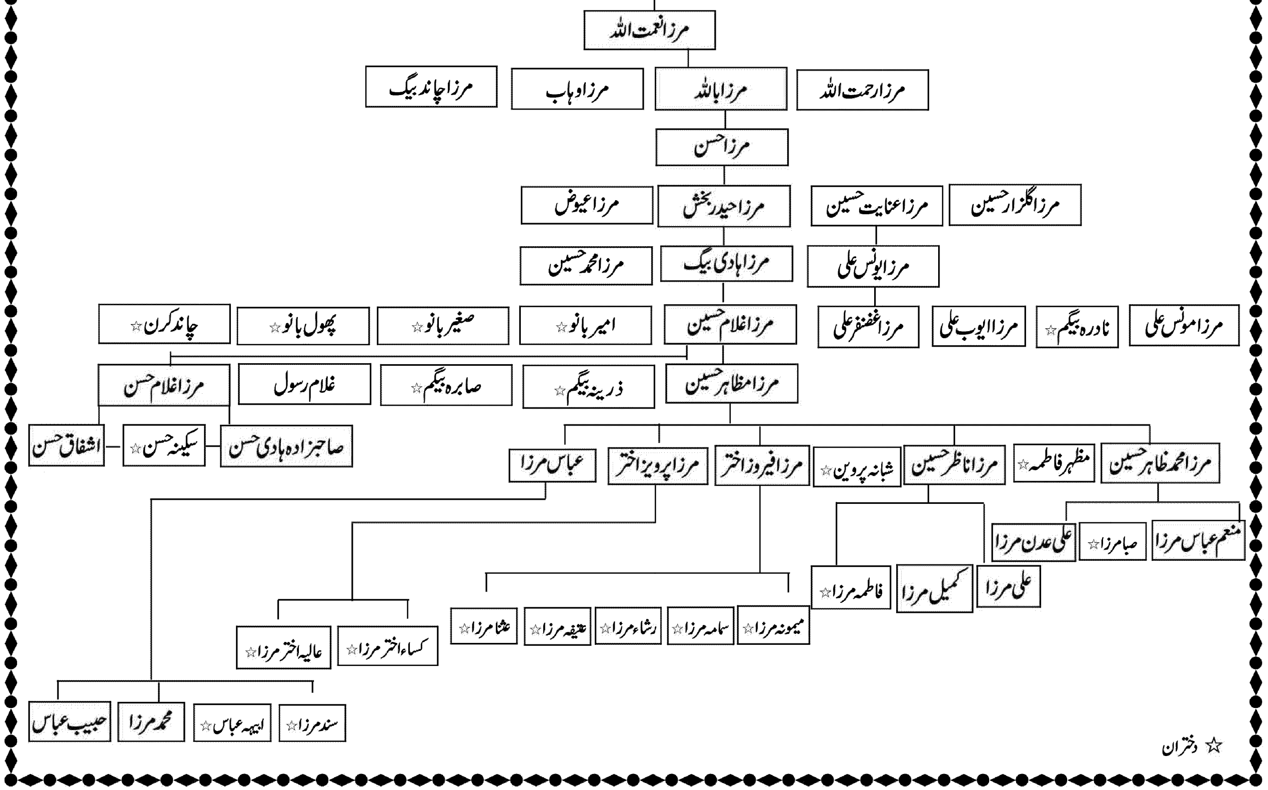
میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ پڑھائی مکمل ہونے کے بعد یونیورسٹی سے ہی سروس کی شروعات ہوئی۔ علی گڑھ سے ہی محترمہ رضیہ زیدی سے شادی کی جو کہ میری اہلیہ ہیں۔ ایک پیاری سی بیٹی سکینہ حسن ہیں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جن کی شادی اپنے برادرِ عزیز مرزا مظاہر حسین کے صاحبزادے مرزا پرویز اختر سے کی جو اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ اس وقت یو۔اے۔ای میں کوالٹی منیجر ہیں اس کے علاوہ دو بیٹے صاحبزادہ ہادی حسن (پرسنل منیجر حال مقیم یو۔اے۔ای) اور اشفاق حسن ہیں جو ابھی زیرِ تعلیم ہیں اور ایم۔بی۔اے۔ کے طالب علم ہیں۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ ہی چمپئی رنگ رہا دیدہ ور لوگ جس کی ستائش کیا کرتے تھے اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے اور میں ہوں اور رہ گئے ہیں چلتے پھرتے سائے وکچھ بیتے ہوئے لمحوں کی پرچھائیاں۔

غزل



عکسِ تحریر

شجرہ نسب مرزا غلام حسین مرحوم ابن مرزا ہادی بیگ مرحوم، قصبہ سانکھنی، ضلع بلندشہر، اتر پردیش

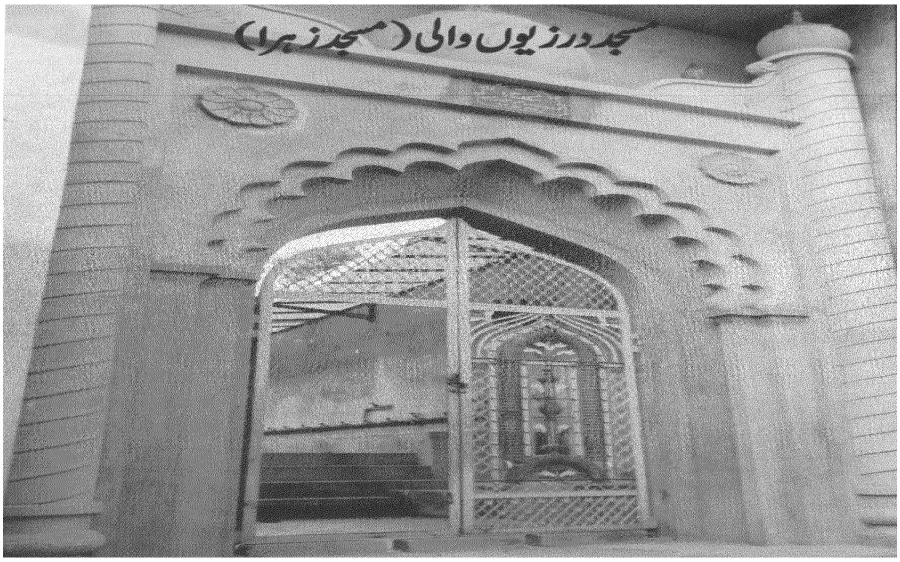


انجمن آل اطہر (رجسٹرڈ) سانکھنی

انجمن حیدری (رجسٹرڈ) سانکھنی ہی کی طرح انجمن آل اطہر کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انجمن آل اطہر ۱۹۳۷ء میں وجود میں آئی اس کو پروان چڑھانے میں محترم محمد حسین صاحب (حال مقیم پاکستان) کا نام سنہری اوراق میں لکھا جائیگا۔ انجمن کا رجسٹریشن ۱۹۸۷ء میں عمل میں آیا۔ انجمن کے اغراض ومقاصد بھی دینی ودنیاوی تعلیم کے علاوہ عزاداری کو فروغ دینا ہیں۔

انجمن آلِ اطہر اور اس سے وابستہ تعمیرات و ادارے

۱۔ درگاہ باب المراد
۲۔ درگاہ شاہ نجف
۳۔ درگاہ بابِ زہرا
۴۔ مسجد زہرا (مسجد درزیوں والی)
۵۔ شیعہ مسجد
۶۔ مکتب امامیہ آلِ اطہر اسکول
۷۔ رہائش گاہ پیش نماز انجمن آلِ اطہر
۸۔ آلِ اطہر ہال برہم پوری، دہلی
۹۔ مسجد منِہار/لوہاروں والی (اب سنّی وقف بورڈ کے تحت)



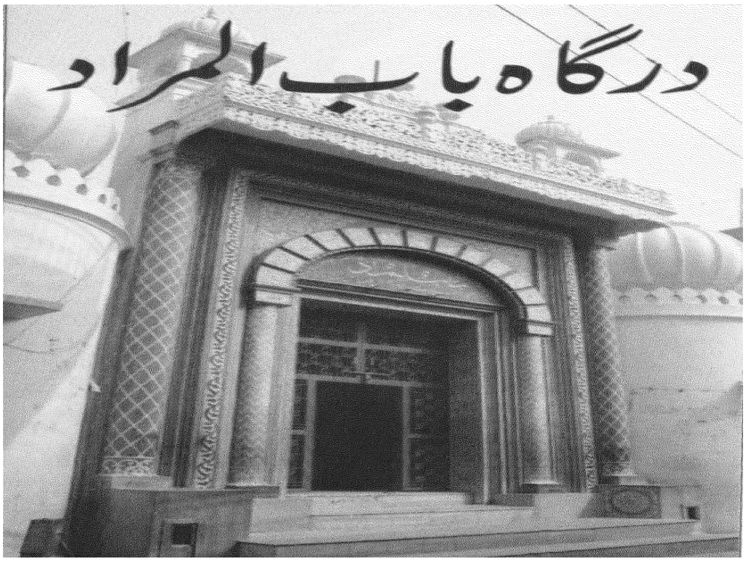
مسجد زہرا (درزیوں والی)

مسجد زہرا کو ''مسجد درزیوں والی'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ مسجد کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ سانکھنی میں خیاط کی تعداد زمانۂ قدیم میں زیادہ رہی ہوگی۔ اس مسجد میں اہلِ سنت (خیاط فرقہ) ہی نماز ادا کرتے تھے۔ ضلع کی تاریخ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کو بھی ۱۵۰ سال قبل بنایا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ خیاط حضرات کا سانکھنی سے دہلی وگردونواح میں اپنے کاروبار کی خاطر ہجرت کرنا شروع ہوگیا اور یہ مسجد بوسیدہ حالت میں آگئی۔ خیاط فرقہ ایام عزاء میں آتا ہے انھوں نے اس مسجد کو انجمن آلِ اطہر کی نگرانی میں دے دیا۔ انجمن نے مسجد کا نام مسجدِ زہرا میں تبدیل کر ۲۰۱۴ء میں از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس مسجد کو پہلے سے زیادہ وسیع کیا گیا۔ اس مسجد کی خوبصورتی دیکھنے کے قابل ہے۔



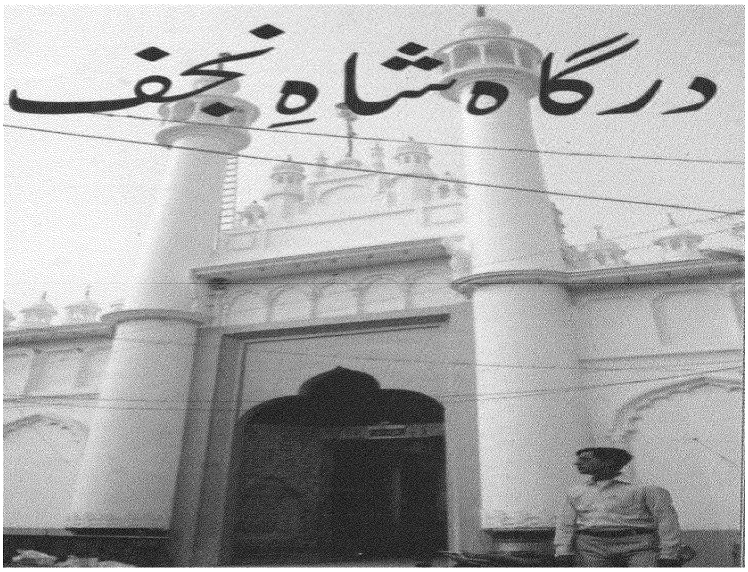
مسجد منہاروں/لوہاروں والی

دیگر مساجد کی طرح یہ مسجد بھی بہت قدیم ہے جس کو تعمیر کئے ہوئے ۱۵۰ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مسجد کو اہلِ سنت والجماعت کے افراد عباسی، منہار، انصاری اور آہنگر فرقے نے تعمیر کرایا تھا۔ زیادہ تر اہلِ سنت فرقہ کاروبار کے سلسلے میں وطن سے باہر رہنے لگا جو کہ اپنے کاروبار میں مشغول ہے۔ دورِ حاضر میں یہ مسجد سنّی وقف بورڈ کے تحت ہے ساتھ ساتھ اس کی نگرانی انجمن آلِ اطہر بھی کرتی ہے۔



درگاہ باب المراد

درگاہ باب المراد کی تعمیر ۱۹۵۷ء میں ہوئی اس کو پہلے دالان کے نام سے جانا جاتا تھا اور اس کو کچی مٹی سے بنایا گیا تھا۔ جلد آبادی بندوبست کڑی صاحب ۱۹۵۹ء کے نمبر شمارہ ۱۷۹ پر درج کے مطابق یہ جگہ غلام حیدر مقدم کی درج تھی جو کہ اب ان کے وارثین کے نام درج ہے۔ اس کے احاطے میں مقدم خاندان کا آبائی قبرستان تھا۔ جس میں کچھ بیری کے درخت لگے ہوئے تھے۔ تعمیر نو کا خیال آتے ہی اہلِ سانکھنی کے (امیر وغریب کے بعد) حضرات نے دل جان سے چندہ اکٹھا کیا اور نئی طرز پر تعمیر نو کو بہت ہی عرق ریزی کے ساتھ عملی جامہ پہنایا۔ اس میں باب الحوائج حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام ابن مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کا روضہ مبارک ہے۔ جس کی عمارت کا شمار بلندشہر ضلع کی مشہور عمارت میں ہوتا ہے۔



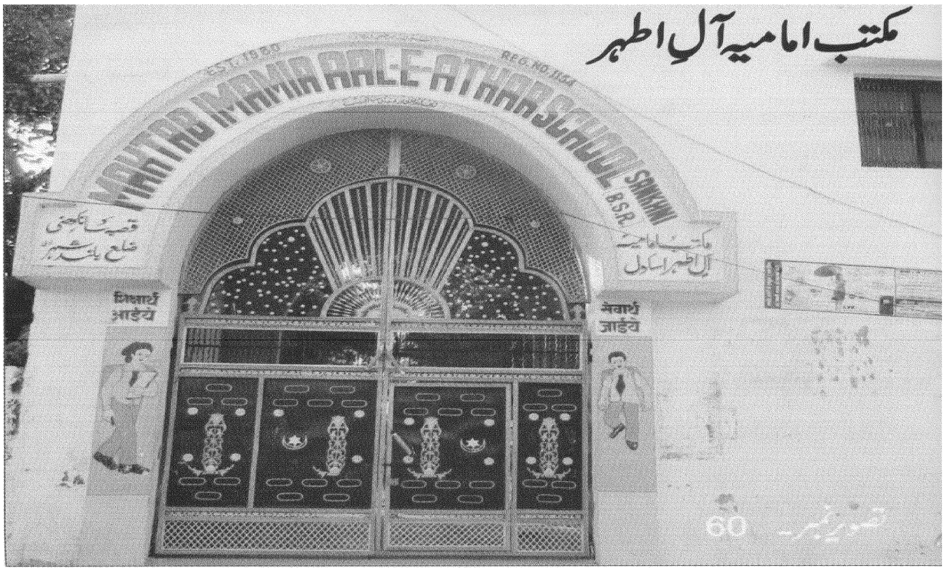
درگاہ شاہِ نجف

تقریباً ۱۹ویں صدی میں اس امام بارگاہ کو شیخ حیات بخش نے بنوایا تھا۔ اس امام بارگاہ کو حیاتی والا امام باڑہ کہا جاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ اس امام بارگاہ کو امام باڑہ جعفریہ اور امام باڑہ شیخان کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ از سرِ نو تعمیر کا خیال آتے ہی محلّہ شیخان نے اپنے معلم حضرات پر مشتمل کمیٹی کو تشکیل دیا۔ ذاکر حسین انجینئرنگ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر عالیجناب سید حسین عباس صاحب نے اس امام بارگاہ کا نقشہ تیار کیا۔ ۱۹۷۶ء میں اس کی از سرِ نو تعمیر شروع ہوئی۔ تعمیر نو کے بعد اس امام بارگاہ کا نام شاہِ نجف میں تبدیل ہوا جس میں مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام ابنِ محسن اسلام حضرت ابوطالب علیہ السلام کا روضہ مبارک ہے۔ ایرانی طرز پر بنائی گئی اس درگاہ کا نام ضلع کی مشہور عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔



درگاہ باب زہرا

بیت المراد حسینیہ، باب المراد اور درگاہ شاہِ نجف ہی کی طرح درگاہ بابِ زہرا بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے جگہ مہیا کرانے کے لیے گرام پردھان جناب مرزا فردوس علی ابن مرزا محمد علی مرحوم کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ اس کے لیے جگہ کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد میں اینٹوں کا ذخیرہ بھی انہوں نے اس امام بارگاہ کو عطیہ کیا تھا۔ اس درگاہ کی انتظامیہ کمیٹی کو الگ سے وجود میں لایا گیا اس کی تعمیر کا کام ۱۹۹۲ء میں شروع ہوا جو کہ آہستہ آہستہ آج تک جاری ہے۔ اس درگاہ میں حضرت محمد ﷺ کا روزہ مبارک اور ان کی جانِ عزیز بیٹی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے روضہ مبارک کی شبیہ ہے۔



مکتب امامیہ آلِ اطہر

جدید تعلیم سے آراستہ مکتب امامیہ آلِ اطہر کی یہ عمارت بہت خوبصورت ہے جو انجمن آلِ اطہر کی زیرِ نگرانی میں ہے۔ یہ درجہ پنجم تک سرکار سے منظور شدہ ہے جس میں دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم کا انتظام ہے۔ مدرسہ کی شکل میں اس کا سنگِ بنیاد محترم مولانا غلام عسکری، بانی تنظیم المکاتب نے اپنے دست مبارک سے ۱۹۸۰ء میں رکھا تھا۔ مدرسہ کی عمارت بن جانے کے بعد تنظیم المکاتب سے اس کا الحاق ختم کر دیا گیا اور مدرسہ کا نام بدل کر آلِ اطہر پبلک اسکول رکھا گیا۔ بعدازیں اس کی توسیع کی گئی جہاں تک مجھے معلوم ہے اس اسکول کو سرکار سے درجہ آٹھ تک منظور کر لیا گیا ہے۔ سانکھنی جدید تعلیم کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن رہے یہ ہی دعا ہے۔



شیعہ مسجد سانکھنی

کس زباں سے ہو ادا شکرِ خداوندِ قدیر
فضل سے جس کے بنا ایسا مقام دلپذیر
صنعتِ منقوط میں صادقؔ لکھو تاریخ تم
مسجد جامع ہے بیشک بے جواب و بے نظیر ۱۳۱۷ھ

مسجد شیعہ پر جو پتھر نسب ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مسجد کی بنیاد ۱۸۹۹ء بمطابق ۱۳۱۷ھ میں رکھی گئی۔ اس سے قبل سبھی حضرات مغل شیعہ جامع مسجد میں ایک ساتھ نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں شرقی اور غربی حضرات میں کچھ اختلاف پیدا ہوئے جس کی وجہ سے ۱۸۹۹ء میں شیعہ مسجد کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۳۹ء تک بھی یہ مسجد پوری طرح مکمل نہیں تھی۔ ۱۹۵۷ء میں مغل شیعہ جامع مسجد کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد انجمن آلِ اطہر نے بھی شیعہ مسجد کی شمال و جنوب میں توسیع فرمائی اور اس کو مکمل کیا۔ آج یہ مسجد پوری طرح مکمل ہے اور اس کی خوبصورتی دل کو موہ لیتی ہے۔

یاد جب آتی ہے تنہائی میں تیری اے دوست
اس گھڑی دل کا دھڑکنا بھی گراں ہوتا ہے

ڈاکٹر علی احمد برنی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ قصبہ سانکھنی کے ایک عزت دار شیخ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر علی احمد برنی ایک دردمند دل کے مالک تھے انھوں نے اپنے برادرِ عزیز ڈاکٹر محمد احمد برنی (جو کہ خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس، ایم ڈی تھے) کے خیالات کا اثر قبول کیا تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُن کے دل میں وطن کی محبت، اس کی اصلاح اور ترقی کا جذبہ اور اس کی تعمیر کی تڑپ تھی۔ اپنے ہم عصروں سے محبت کا جذبہ حد سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر علی احمد برنی کے اخلاق نہایت وسیع تھے وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے آتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک بار ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اُن کے دوستوں کا حلقہ اہلِ سانکھنی کے علاوہ دیگر جگہوں پر بھی بہت زیادہ تھا۔ ڈاکٹر علی احمد برنی کے حلقۂ احباب میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ الگ الگ لوگوں سے ان کے تعلقات کی نوعیت بھی الگ تھی۔

ہم وطن اور علی گیرین ہونے کے ناطے ہماری محبت جس طرح تیزی سے پروان چڑھی جلد ہی اس کو وقت کا گہن لگ گیا۔ حالانکہ بہت سے اہلِ سانکھنی حضرات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ لیکن جو مقام ان کا میرے اور میری فیملی کے اندر تھا اس کو کوئی نہ پہنچ سکا۔ جبکہ کہیں کہیں میرے اور ڈاکٹر علی احمد برنی کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔ لیکن حب الوطنی کا جذبہ دونوں میں یکساں تھا۔

زندگی کے آخری لمحوں میں وہ بہت زیادہ خاموش طبیعت اور رنجیدہ سے رہنے لگے تھے۔ اُن کی شادی کو چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن ابھی بھی اہلیہ کی گود خالی تھی۔ اپنی اہلیہ شاداب فاطمہ سے دلی محبت رکھتے تھے خاموشی کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ بڑے بھائی ڈاکٹر محمد احمد برنی کے یہاں بھی پیاری پیاری سی چار بیٹیاں تھیں اسی لئے ان کو ایک بیٹے کی تمنا تھی جو اس خلاء کو پُر کر سکے۔ اُن کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور اچانک ۲۹؍جنوری ۲۰۰۷ء کو اپنے معبود حقیقی کی طرف کوچ کر گئے۔

فخرِ سانکھنی مرزا شمس الحسن، آئی۔جی

مرزا شمس الحسن 1؍نومبر 1950 کو صوبہ اترّ پردیش کے مشہور و معروف ضلع بلند شہر کی مردم خیز بستی سانکھنی کے ایک متوسط اور مہذّب خانوادے میں پیدا ہوئے ان کے والدِ بزرگوار کا نام مرزا محمّد ظفر تھا جنہیں بستی کے تمام لوگ ظفر بابو کے نام سے مخاطب کرتے تھے ان کے والد پیشے کے اعتبار سے دہلی میں پوسٹل سروس میں افسر تھے جو رزقِ حلال کو اپنا اوّلین فریضہ سمجھتے تھے مرزا شمس الحسن تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے مگر بچپن سے بہت ذہین تھے وہ اپنی طالبِ علمی کے زمانے سے ہی پڑھائی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

مرزا شمس الحسن نے اپنی ابتدائی تعلیم درجہ اوّل سے درجہ پنجم تک اسلامیہ امدادی مکتب سانکھنی میں حاصل کی بلکہ اس وقت درجہ پنجم میں اوّلین پوزیشن حاصل کی، ہائی اسکول جنتا انٹر کالج جہانگیر آباد اور انٹر میڈیٹ کی تعلیم بی پی اے ایس انٹر کالج جہانگیر آباد سے حاصل کی انٹر میڈیٹ کے بعد گریجوئیشن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا مگر کن ہی وجوہات کی بنا پر بیچ میں تعلیم چھوڑ کر دسمبر 1968 میں لاہور چلے گئے اس وقت ان کی عمر 18 سال تھی لاہور اس وقت کوئی معمولی شہر نہیں تھا تقسیمِ ہند سے پہلے لاہور کو ہندوستان کا پیرس کہا جاتا تھا کیونکہ تعلیم کا اعلیٰ ترین مرکز لاہور ہی تھا لوگ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لاہور چلے آتے تھے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا جس میں انتہائی ذہین طالبِ علم ہی یہ اعزاز حاصل کر سکتے تھے مگر مرزا شمس الحسن نے پہلے ہی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں گریجوئیشن میں داخلہ پا لیا یہ خود ان کے اور وطن کے لیے فخر کی بات تھی۔ گریجوئیشن کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے سیاسیات میں ماسٹرس کی سند حاصل کی اور لاء کالج لاہور سے ایل ایل بی کا امتحان اعزازی نمبروں سے پاس کیا مرزا

شمس الحسن نے محکمۂ پولس میں اے ایس پی کے عہدے سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا، اس کے علاوہ ان عہدوں پر فائض رہے

DG IG/GASP,SP, SSP,DIG,Addl I

Sectt.PMSecretary NCGR/

مرزا شمس الحسن نے فرائضِ منصبی کو اتنی ایمانداری اور جانفشانی کے ساتھ نبایا جس کے بعد انہیں صوبہ پنجاب کا اے آئی جی مقرّ ر کیا گیا آئی جی کے عہدے پر رہ کر ایک ایماندار پولس آفیسر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی، کوئی بھی شخص اپنی ذات، رنگ یا نسل کی بنیاد پر نہیں جانا جاتا بلکہ وہ اپنے کردار، اور اپنے کام سے جانا جاتا ہے مرزا شمس الحسن اعلیٰ پولس افسر، حق گو، باضمیر، اپنے فرض کو خلوص سے ادا کرنے والا، نڈر، بے باک، مخلص، انصاف پسند، انسان کو انسان کی نظر سے دیکھنے والا، سیکولر اور ایماندار پولس آفیسر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے اور آئی جی کے عہدے سے سُبک دوش ہوئے سانکھنی کو اپنے اس فرزند پر فخر ہے جس نے پاکستان میں رہ کر وطن کا نام روشن کیا اور نئی نسل کے لئے ان کی ہمہ جہت شخصیت نے اپنے مستقبل کی تعمیر اور تشکیل کرنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے اتنے طویل عرصے کے بعد بھی ان کا وطن کے لئے جنون اور وطن سے ان کی محبت اپنے آپ میں ایک مثال ہے ان کی رگوں میں خون نہیں وطن سے عقیدت اور محبت کے جذبات دوڑتے ہیں۔

انمول موتی

☆ انسان کو حکم تھا اپنے نفس کو مار دو مگر انسان نے اپنے ضمیر کو مار دیا۔
☆ منافق اور بدتمیز کا فرق کیا جائے تو بدتمیز اتنا خطرناک نہیں جتنا منافق۔
☆ میری خاموشی کا راز مجھے خود نہیں معلوم، جانے کیوں لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔
☆ لوگ اکثر نرم لہجوں سے کتنی سخت بات کر جاتے ہیں کہ ان کے لفظوں کی تپش بھولنے میں ایک عمر لگ جاتی ہے۔
☆ بول دیتے ہیں سن نہیں سکتے، لوگ کتنے عجیب ہوتے ہیں۔
☆ طوفان زندگی میں آنا بھی ضروری ہے تا کہ پتہ چلے کہ کون ہاتھ پکڑ کر بھاگ رہا ہے اور کون ہاتھ چھوڑ کر۔
☆ مار تو لوگ پہلے ہی دیتے ہیں انتظار کرتے ہیں تو صرف دفنانے کا۔
☆ میٹھے لوگوں سے مل کر میں نے جانا کڑوے لوگ اکثر سچے ہوتے ہیں۔
☆ زبان کی حفاظت دولت سے زیادہ مشکل ہے۔
☆ ماضی کو ماضی میں ہی چھوڑ دینا چاہیئے ورنہ وہ حال خراب کر دیتا ہے اور مستقبل بھی۔
☆ کبھی ماں باپ یاد آئیں تو بہن بھائی مل کر بیٹھا کرو، کسی کے چہرے پر ماں مسکراتی ہوئی نظر آئے گی تو کسی کے لہجے پر باپ۔
☆ غریب کتنا ہی خوش اخلاق کیوں نہ ہو لوگ اس کے اخلاق کو اس کی مجبوری سمجھتے ہیں۔
☆ جو دل کے سچے ہوتے ہیں وہ اکثر تنہا رہتے ہیں۔
☆ مجھ سے کسی نے پوچھا کہ درد کی قیمت کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے کیا پتہ مجھے تو لوگ مفت میں ہی دے دیتے ہیں۔
☆ ہماری موجودگی اگر کسی کو پریشان کرتی ہے تو ہمارا پیچھے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔

☆ جن کے اوپر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے ان کو روٹھنے اور ٹوٹنے کا حق نہیں ہوتا۔

☆ وہ انسان کبھی آپ کی قدر نہیں کرے گا جس کے آگے آپ ہمیشہ جھکینگے۔

☆ کربلا میں ایک طرف دریا تھا دوسری طرف پیاس تھی، کمال یہ ہے کہ جو پانی پیتے رہے وہ مر گئے جو پیاسے تھے وہ آج بھی زندہ ہیں۔

☆ سلامتی اسی میں ہے کہ اپنا منہ بند رکھو جب تک مچھلی کا منہ بند رہتا ہے وہ کانٹے کی گرفت میں نہیں آتی۔

☆ کچھ لوگ گھڑی کی طرح ہوتے ہیں جب بھی ان کی طرف دیکھو اپنی اوقات بتا دیتے ہیں۔

☆ اگر کچھ الگ کرنا ہے تو بھیڑ سے ہٹ کر چلو۔ بھیڑ حوصلہ تو دیتی ہے مگر پہچان چھین لیتی ہے۔

☆ زہر مرنے کی لئے تھوڑا مگر جینے کی لئے بہت پینا پڑتا ہے۔

☆ ماں باپ کی جتنی ضرورت ہمیں بچپن میں ہوتی ہے اتنی ہی ضرورت ان کو بڑھاپے میں ہماری ہوتی ہے۔

☆ عجیب قصہ ہے زندگی کا اجنبی حال پوچھ رہے ہیں اپنوں کو خبر نہیں۔

☆ زندگی ذرا لمبی ہو جائے تو اولاد بھی اچھا خاصہ سبق سکھا دیتی ہے۔

☆ اپنا غم ہر کسی کو مت بتایا کیجئے کیوں کہ مرہم ہر گھر میں ہو نہ ہو نمک ہر گھر میں ضرور ہوتا ہے۔

☆ وہ لوگ آپ کی قیمت کبھی نہیں سمجھ سکتے جن لوگوں کے لیے آپ ہمیشہ دستیاب رہتے ہیں۔

☆ جھانکنے کی بہترین جگہ اپنا گریبان اور رہنے کی صحیح جگہ اپنی اوقات ہے۔

☆ آگ اپنے ہی لگا سکتے ہیں، غیر تو صرف ہوا دیتے ہیں۔

☆ انسان کے جسم کا سب سے خوبصورت حصہ دل ہے، اور اگر یہ ہی صاف نہ ہو تو چمکتا چہرہ کس کام کا۔

☆ وہ لوگ اکثر بدل جاتے ہیں جنہیں حد سے زیادہ وقت اور عزت دی جائے۔

☆ قدر کرنی ہے تو زندگی میں کرو، چہرے سے کفن اٹھاتے وقت تو نفرت کرنے والے بھی رو پڑتے ہیں۔

☆ دوسروں پر نظر رکھنے سے بہتر ہے آپ خود پر نظر ثانی کریں۔

☆ اپنا کوئی کیا بگاڑے گا اپنی تو قسمت اس نے لکھی ہے جس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

☆ آزاد کر دینا چاہیئے ان رشتوں کو جن کو باندھ کر رکھنا پڑے۔
☆ ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھا کرو، ہوسکتا ہے کسی کا بہت بڑا کام تمہاری چھوٹی سی دعاء کا محتاج ہو۔
☆ جب تعلق ضرورت کے ہوں تو ان کی یاد بھی ضرورت کے وقت آتی ہے۔
☆ دنیا اگر بہترین جگہ ہوتی تو یہاں کوئی روتا ہوا پیدا نہ ہوتا۔
☆ زندگی کی اصل خوبصورتی یہ نہیں کہ آپ کتنے خوش ہیں بلکہ زندگی کی اصلی خوبصورتی یہ ہے کہ دوسرے آپ سے کتنا خوش ہیں۔
☆ اپنا سر اونچا رکھو کہ تم کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن اپنی نگاہیں نیچی رکھو تا کہ پتا چلے تم ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔
☆ بھروسہ خود پہ رکھو تو طاقت بن جاتی ہے اور دوسروں پر رکھو تو کمزروی بن جاتی ہے۔
☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔
☆ حسد کرنے والے کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جب تم خوش ہوتے ہو تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔
☆ تکبر چاہے دولت کا ہو، طاقت کا ہو، رتبے کا ہو، حتیٰ کے تقویٰ کا ہی کیوں نہ ہو، انسان کو رسوا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔
☆ بہت مشکل ہوتا ہے ہنس کر درد برداشت کرنا۔
☆ غلطی پر ساتھ چھوڑنے والے بہت ملتے ہیں، سمجھا کر ساتھ نبھانے والے بہت کم ملتے ہیں۔
☆ توبہ جب نہیں ہوتی جب آپ روتے ہیں، توبہ تو تب ہے جب آپ بدلتے ہیں۔
☆ جب نظر انداز کرنا شروع کر دیا جائے تو کہو نہیں، کنارہ کرلو۔
☆ راستے اور فاصلے میں بڑا فرق ہوتا ہے، راستے طے کرنے پڑتے ہیں اور فاصلے سمیٹنے پڑتے ہیں۔
☆ ماں زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی کا مینار ہے اور باپ ٹھوکروں سے بچانے والا مضبوط سہارا۔

☆ انسان گھر بدلتا ہے، لباس بدلتا ہے، دوست بدلتا ہے، پھر بھی پریشان کیوں رہتا ہے؟ کیونکہ وہ خود کو نہیں بدلتا۔

☆ منھ میں زبان سب رکھتے ہیں مگر کمال وہ کرتے ہیں جو سنبھال کر رکھتے ہیں۔

☆ ماں باپ کی باتیں کڑوی ہوتی ہیں مگر یاد رکھیں نیم کے پتے کڑوے ہی سہی مگر خون تو صاف کرتے ہیں۔

☆ خواب دیکھنے کے لیے سونا ضروری نہیں لیکن خواب پورا کرنے کے لیے جاگنا بہت ضروری ہے۔

☆ دنیا میں انسان کو ہر چیز مل جاتی ہے صرف اپنی غلطی نہیں ملتی۔

اچھی بات

☆ اللہ کی چار رحمتیں جو انسان سے برداشت نہیں ہوتیں:

(۱) بیٹی (۲) مہمان (۳) بارش (۴) بیماری

☆ اللہ کے چار عذاب جو انسان خوشی سے قبول کر لیتا ہے:

(۱) جہیز (۲) سود (۳) غیبت (۴) جھوٹ

زندگی کے پانچ سچ

☆ ماں کے سوا کوئی وفادار نہیں ہوسکتا۔

☆ غریب کا کوئی دوست نہیں ہوسکتا۔

☆ آج بھی لوگ اچھی سوچ کو نہیں اچھی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

☆ عزت صرف پیسے کی ہے انسان کی نہیں۔

☆ جس شخص کو اپنا خاص سمجھو زیادہ تر وہی شخص دکھ درد دیتا ہے۔

ایک پیارا سچ

☆ جو انسان ہر وقت سب کی خوشی چاہتا ہے، سب کے بارے میں اچھا سوچتا ہے، سب کا خیال رکھتا ہے، وہی انسان زندگی میں ہمیشہ سب سے اکیلا رہ جاتا ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ جن کے کان باہر ہوتے ہیں وہ بچہ دیتے ہیں اور جن کے کان اندر ہوتے ہیں وہ انڈا دیتے ہیں۔

☆ جو جانور آگے کے پیروں سے بیٹھتے ہیں وہ حلال ہوتے ہیں اور جو جانور پیچھے کے پیروں سے بیٹھتے ہیں وہ حرام ہوتے ہیں۔